الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

اگر آپ درست طریقہ اختیار نہ کریں تو آپ
پانے والی چیز کو بھی پانے میں ناکام رہیں گے

مارچ ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۸۸

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مارچ ۱۹۸۴
شمارہ ۸۸

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ - نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

اعلان

ادارۂ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ. نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013 (India)

Phone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

پیغمبر اسلام کا اسوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام مُسَیلِمہ بن حُبَیِّب تھا۔ وہ یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے پیغمبر ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ ۱۰ھ ہجری میں اس نے اپنے دو آدمیوں کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

من مسیلمۃ رسول اللہ الیٰ محمد رسول اللہ سلام علیك۔ اما بعد فانی قد اُشرکت فی الامر معك۔ و ان لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون (سیرۃ ابن هشام)

مسیلمہ خدا کے رسول کی طرف سے محمد خدا کے رسول کے نام۔ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ اس کے بعد یہ کہ میں نبوت میں تمہارے ساتھ تمہارا شریک بنا دیا گیا ہوں اور یہ کہ نصف زمین (عرب) ہمارے لئے ہے اور نصف زمین قریش کے لئے۔ مگر قریش حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔

مسیلمہ کے سفیر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کا خط پڑھا گیا تو آپ نے سفیروں سے پوچھا کہ تم لوگوں کا کہنا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا: اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کئے جاتے تو میں تم دونوں کی گردن مار دیتا (اما واللہ لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما) اس کے بعد آپ نے مسیلمہ کو حسب ذیل خط لکھوایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من رسول اللہ الیٰ مسیلمۃ الکذاب۔ السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ اما بعد فان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد اللہ کے رسول کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ سلامتی ہے اس شخص کے لئے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اور زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام صرف متقیوں کے لئے ہے۔

اس واقعہ میں ایک طرف سچے رسول اور جھوٹے رسول کا تقابل ملتا ہے۔ مسیلمہ کا خط واضح طور پر جھوٹے رسول کا خط ہے اور پیغمبر اسلام کا خط واضح طور پر سچے رسول کا۔

دوسری بات جو پیغمبر اسلام کے اسوہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ غیر قوم کا سفیر خواہ وہ بدترین مجرم کیوں نہ ہو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو اس کے وطن کی طرف واپس کر دیا جائے گا۔ ان معاملات میں بین اقوامی اصول ہی اسلام کا اصول ہے۔

۲۵ واں گھنٹہ

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے ۲۵ واں گھنٹہ :

25th Hour

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کی ایسی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف انسانیت کی مجموعی ہلاکت ہو۔ ہتھیاروں کی اندھادھند ریس نے دنیا کو خطرناک ہتھیاروں کا گدام بنادیا ہے۔ مسلسل جنگی تیاریوں نے دنیا کو اپنی بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہمارا ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوچکا ہے 24th hour is past اب پچیسواں گھنٹہ (خاتمہ کا گھنٹہ) شروع ہونے والا ہے۔

مصنف نے جو بات " انسانی جنگ " کے بارہ میں کہی ہے وہ " خدائی قیامت " کے بارہ میں زیادہ صحیح ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا کو محدود مدت کے لئے امتحان کے واسطے پیدا کیا ہے۔ یہ مدت صرف خدا کے علم میں ہے، وہ ہم کو تعین کے ساتھ معلوم نہیں۔ کسی بھی لمحہ خدا اس مدت کے خاتمہ کا اعلان کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور اس کا سارا تمدن عظیم زلزلہ کے ذریعہ تباہ ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئی ابدی اور کامل دنیا تخلیق کی جائے گی۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمین پر ہمارا ہر لمحہ گویا آخری لمحہ ہے۔ اگر ہم اپنی صبح میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم شام نہ کرسکیں۔ اگر ہم اپنی شام میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں دوبارہ صبح دیکھنے کو نہ ملے۔

موجودہ دنیا میں ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلت عمر پوری کرچکی ہو۔ انسان اپنے " ۲۴ ویں گھنٹے " کو ختم کرکے ۲۵ ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہوجائے۔

لوگ نیوکلیر جنگ کے خطرہ سے ڈر رہے ہیں۔ حالاں کہ انھیں خدا کی طرف سے قیامت کا صور پھونکا جانے سے ڈرنا چاہئے۔ کیوں کہ نیوکلیر جنگ کا ہونا یقینی نہیں۔ مگر قیامت کا آنا یقینی بھی ہے اور اس کا انجام ابدی بھی۔

پرستش کیا ہے

نیلما دیوی (Nilima Devi) ہندستان کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ رقص کو ایک خدائی آرٹ (Divine art) سمجھتی ہے۔ وہ اپنے فن میں اتنا ڈوبی ہوئی ہے کہ وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ رقص کی صورت میں جو کچھ ظاہر کرنا چاہتی ہے وہ ان کو ظاہر نہیں کرپاتی۔ جسمانی حرکات کی محدودیت اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایک انٹرویو (ہندستان ٹائمس، ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳) میں اس نے کہا کہ رقص وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں جسمانی حرکات ختم ہو جاتی ہیں:

The dance starts where the gymnastics end.

نیلما دیوی کا کہنا ہے کہ وہ رقص کا کام بطور پیشہ کے نہیں کرتی۔ یہ میرے لئے ایک طریق زندگی ہے۔ انٹرویو لینے والے کے الفاظ میں، جب وہ رقص نہیں کرتی تو وہ اپنے آپ کو خالی محسوس کرتی ہے۔ ایسے لمحات میں اس کے پاس کوئی نقطۂ ارتکاز نہیں ہوتا جس میں وہ اپنی زندگی کو مرتکز کرسکے:

She says when she is not dancing she feels empty.
There is no focal point in her life at such moments.

رقاصہ نے جس چیز کو طریق زندگی (Way of life) کہا، اسی کا دوسرا نام پرستش ہے۔ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن کی پرستش ایک رقاصہ کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ اس کے اندر گہرے جذبات پیدا کر دیتی ہے ـــــ وہ رقص کو اس کے لئے زندگی بنا دیتی ہے۔ اس کے اندر جذبات کا ایسا طوفان برپا ہوتا ہے جس کے اظہار سے وہ اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتی ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے رقص کے ذریعہ وہ جو کچھ کہہ سکی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی خالی ہو جاتی ہے۔ اس سے الگ ہو کر وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا مرکزی نقطہ باقی نہیں رہا جہاں وہ اپنے وجود کو سمیٹ سکے۔

خدا کی پرستش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ ایک خدائی رقص ہے۔ جب کوئی بندہ اپنے رب کو پاتا ہے تو یہ اس کے لئے اتنا عظیم واقعہ ہوتا ہے کہ وہ رقص کر اٹھتا ہے۔ اس کا وہی حال ہو جاتا ہے جو مذکورہ مثال میں فن کے پرستار کا نظر آتا ہے ـــــ خدا اس کے تمام وجود کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ خدا سے الگ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ خدا کے بارہ میں اس کے اندر ایسے گہرے جذبات اٹھتے ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے وہ الفاظ نہ پاسکے۔

ٹوٹنے کے بعد

مادہ کی آخری اکائی ایٹم ہے جس طرح سماج کی آخری اکائی فرد ہوتا ہے۔ اگر ہم ایٹم کو توڑنے میں کامیاب ہوجائیں تو ہم اس کو فنا نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو ایک نئی اور زیادہ بڑی قوت میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کا نام جوہری توانائی (Atomic energy) ہے۔ مادہ منجمد توانائی ہے اور توانائی منتشر مادہ۔ مادہ اپنی ابتدائی شکل میں جتنی قوت رکھتا ہے، اس کے مقابلہ میں اس وقت اس کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے جب کہ اس کے ایٹموں کو توڑ کر جوہری توانائی میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔

معمولی مادی قوت اور جوہری قوت میں کیا فرق ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دو ٹن کوئلہ ایک ریل گاڑی کو ستر میل تک لے جاتا ہے اور نو گیلن کروسین ایک موٹر کو پانچ سو میل تک دوڑانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بارہ پونڈ یورینیم جب جوہری توانائی میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ایک تیز رفتار راکٹ کو دو لاکھ چالیس ہزار میل کا سفر طے کرا سکے۔

ایسا ہی معاملہ اس سماجی اکائی کا ہے جس کو انسان کہتے ہیں۔ انسان جب "ٹوٹتا ہے" تو وہ بے پناہ حد تک وسیع ہو جاتا ہے۔ جس طرح مادہ ٹوٹنے سے فنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوت بڑھا لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی ہستی جب "شکست" سے دوچار ہوتی ہے تو وہ ختم نہیں ہوتی بلکہ نئی شدید تر طاقت حاصل کر لیتی ہے۔

انسان پر شکست کا حادثہ گزرنا اس کے تمام اندرونی تاروں کو چھیڑنے کے ہم معنی ہے۔ اس کے بعد اس کے تمام احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی طاقتیں اپنی ناکامی کی تلافی کے لئے حرکت میں آجاتی ہیں۔ اس کے عزم و ارادہ کو مہمیز لگتی ہے۔ اس کے اندر ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کا وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو سیل رواں کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ اس کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، حتیٰ کہ پتھریلی چٹانوں کے بس میں بھی نہیں۔

مادہ کے اندر ایٹمی انفجار (Atomic explosion) اس کو بہت زیادہ طاقت ور بنا دیتا ہے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کے اندر بھی بے پناہ امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ یہ امکانات اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ انسانی شخصیت کسی انفجار سے دوچار ہو جائے۔ اس پر کوئی ایسا حادثہ گذرے جو اس کی شخصیت کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ جو اس کے تاروں کو چھیڑ کر اس کے سازِ حیات کو بجا دے۔

ناموافق حالات

جانوروں کو جنگل کے ماحول میں ہر وقت اپنے دشمنوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ہر وقت چوکنے رہتے ہیں۔ یہ چوکنا رہنا ان کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی فطری صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ ان کی شخصیت ختم ہونے نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کو پالنے کے لئے جو بڑے بڑے پارک بنتے ہیں ان میں مصنوعی طور پر ان کے لئے خطرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مثلاً خرگوش کے پارک میں بلّی ڈال دی جاتی ہے یا ہرن کے پارک میں ایک شیر یا ایک بھیڑیا ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح جانوروں کی چوکسی (Alertness) باقی رہتی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کی خاطر ہر وقت زندہ اور سرگرم رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دھیرے دھیرے وہ بجھ کر رہ جائیں گے۔

یہی بات انسانوں کے لئے بھی صحیح ہے۔ انسان کے اندر بے شمار صلاحیتیں ہیں۔ یہ صلاحیتیں عام حالات میں سوئی رہتی ہیں۔ وہ بیدار اس وقت ہوتی ہیں جب ان کو جھٹکا لگے۔ جب وہ عمل میں آئیں۔ کسی بھی مقام پر اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جن خاندانوں میں آسودگی کے حالات آجاتے ہیں اس کے افراد بے حس اور کم عقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جن خاندانوں کو مشکل حالات گھیرے ہوئے ہوں ان کے افراد میں ہر قسم کی ذہنی اور عملی صلاحیتیں زیادہ اجاگر ہوتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے ماحول میں عدم تحفظ کی صورت حال میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ اور مدینہ کے مسلمان اس سے کہیں زیادہ عدم تحفظ کی صورت حال میں مبتلا تھے۔ اگر عدم تحفظ کوئی "برائی" ہوتی تو یقیناً اللہ کا رسول اور اس کے اصحاب کہیں زیادہ اس کے مستحق تھے کہ اللہ انھیں اس برائی سے دور رکھے۔ مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ان کو مسلسل عدم تحفظ کی صورت حال میں رکھا۔ ان کو اپنی زندگی میں کبھی چین اور آسودگی نہ مل سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے جس ڈھنگ پر بنایا ہے وہ یہی ہے کہ یہاں دبنے سے ابھار پیدا ہو۔ مشکلوں کے مدرسہ میں انسان کی اعلیٰ تربیت ہو۔ غیر محفوظ حالات کے اندر مستعدی کا ظہور ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انھیں لوگوں نے بڑی بڑی ترقیاں حاصل کیں جو حالات کے دباؤ میں مبتلا تھے۔ قدرت کا یہی قانون افراد کے لئے ہے اور یہی قوموں کے لئے۔

حقیقت پسندی نہ کہ شوق

شہد کی مکھیاں اپنا چھتہ جہاں بناتی ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پھولوں کا مقام اس سے کئی میل دور ہوتا ہے۔ ایک پھول میں بہت تھوڑی مقدار رس کی ہوتی ہے۔ اس لئے بھی اس کو بہت دور دور تک جانا ہوتا ہے تاکہ بہت سے پھولوں کا رس چوس کر اپنی مقدار حاصل کر سکے۔

شہد جمع کرنے والی مکھی سارے دن اڑانیں بھرتی ہے تاکہ وہ ایک ایک پھول کا رس نکالے اور اس کو لا کر اپنے چھتہ میں جمع کرے۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ شہد کی مکھی صبح جب اپنے پہلے سفر پر نکلتی ہے تو اندھیرے میں روانہ ہوتی ہے۔ مگر شام کو جب پھولوں کے مقام سے وہ اپنی آخری باری کے لئے چلتی ہے تو اس کا یہ سفر نسبتاً اجالے میں ہوتا ہے۔ پہلی باری کے لئے اندھیرے میں چلنا اور آخری باری کے لئے اجالے میں سفر شروع کرنا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دونوں وقتوں کا فرق ہے۔ صبح کے وقت سفر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اندھیرے سے اجالے کی طرف جا رہی ہے۔ جب کہ شام کے وقت سفر کا مطلب اجالے سے اندھیرے کی طرف جانا ہے۔

شہد کی مکھی وقت کے اس فرق کو ملحوظ رکھتی ہے اور اس کی پوری طرح رعایت کرتی ہے۔ شہد کی مکھی اپنے لمبے سفر کو چونکہ سورج کی روشنی ہی میں صحیح صحیح انجام دے سکتی ہے۔ اندھیرے میں میں اس کا امکان رہتا ہے کہ وہ بھٹک جائے اور اپنی منزل پر نہ پہنچے، اس لئے صبح کو وہ اپنی پہلی باری اندھیرے میں شروع کر دیتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اگلے لمحات اجالے کے لمحات ہوں گے۔ اس کے برعکس شام کو اپنی آخری باری کے لئے وہ اجالا رہتے ہوئے چل پڑتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ جتنی دیر ہوگی اتنا ہی اندھیرا بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اس طرح قدرت بتاتی ہے کہ زندگی میں ہمارا ہر قدم حقائق کی بنیاد پر اٹھنا چاہئے نہ کہ خوش فہمیوں اور موہوم امیدوں کی بنیاد پر۔ آنے والے لمحات کبھی "اندھیرے" کے لمحات ہوتے ہیں اور کبھی "اجالے" کے لمحات، اگر اس فرق کی رعایت نہ کی جائے اور آنے والے لمحات کا لحاظ کئے بغیر بے خبری میں سفر شروع کر دیا جائے تو آنے والا لمحہ ہماری رعایت نہیں کرے گا۔ وہ اپنے نظام کے تحت آئے گا نہ کہ ہماری خوش فہمیوں کے تحت۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی ہم سمجھیں گے کہ ہم روشن مستقبل اور شاندار انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگلا لمحہ جب آئے گا تو معلوم ہوگا کہ ہم صرف اندھیروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دانش مندی کے ذریعہ

کیا یہ ممکن ہے کہ زندہ شیر کا مطالعہ کھلے جنگل میں عین اس کے قریب بیٹھ کر کیا جائے۔ اس طرح کہ آدمی اس کو چھوئے اور اس کے جسم کے اعضاء کی صحیح پیمائش کرسکے۔ بظاہر یہ ایک ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ مگر خدا نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ ایسی عجیب و غریب ہے کہ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

امریکہ کے ایک ماہر حیوانات جارج بی شیلر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ شیلر کو شیر ببر کی عادات و خصوصیات پر ایک کتاب لکھنی تھی۔ چنانچہ اس نے دو سال تک کھلے جنگل میں زندہ شیروں کے بالکل قریب جا کر ان کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس قریبی مطالعہ کے ذریعہ جنگل کے بادشاہ کے بارہ میں عجیب عجیب حقائق دریافت کیے۔ مثلاً یہ کہ شیر ببر نہایت سست اور کاہل درندہ ہے۔ شیروں کے اکثر بچے بھوکے مر جاتے ہیں کیوں کہ ان کے ماں باپ اپنی سستی کی وجہ سے اپنے بچوں کے لئے خوراک مہیا نہیں کرتے، وغیرہ۔

مسٹر شیلر کو کیسے یہ موقع ملا کہ وہ کھلے جنگل میں زندہ شیر کے بالکل پاس جا کر شیر کا مطالعہ کریں۔ جواب یہ ہے عقل کے ذریعہ۔ مسٹر شیلر نے ایسے کارتوس تیار کیے جن میں گولی کے بجائے بے ہوش کرنے والی دوا بھری ہوتی تھی۔ اس بے ہوشی کے کارتوس کو مخصوص بندوق میں رکھ کر وہ داغتے تو وہ شیر کے پاس پہنچ کر منٹوں میں اس کو غافل اور بے ہوش کر دیتی تھی۔ انھوں نے اس طریقہ کے ذریعہ تقریباً ایک سو شیروں کو بے ہوشی کی دواؤں کا نشانہ بنا کر بے حس کر دیا۔ اور جب وہ بے حس ہو کر زمین پر گر پڑے تو ان کے قریب جا کر ان کی ہر چیز دیکھی اور غور کے ساتھ ان کا مکمل مطالعہ کیا۔

انسان جس طرح جنگل کے خونخوار درندوں کو قبضہ میں کر لیتا ہے، اسی طرح وہ انسانی بستی کے مردم نما بھیڑیوں پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسانی بھیڑیوں پر بھی خدا کی دی ہوئی عقل کو اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح اسے جنگل کے بھیڑیوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک شخص آپ سے کسی اعتبار سے بڑا ہے اور آپ سے اپنی بڑائی منوانا چاہتا ہے تو آپ اس کی بڑائی مان کر اسے "بے ہوش" کر دیجئے اور پھر اپنی خاموش تعمیر میں لگ جائیے۔ اگر آپ ایسا کریں تو بالآخر وہ وقت آجائے گا کہ خود اس کو وہ واقعہ ماننا پڑے جس کا مطالبہ اس سے پہلے وہ آپ سے کر رہا تھا۔

اور تالا کھل گیا

اس کی ناکام کوشش اب جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے تالے کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔ "یقیناً یہ تالے کی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ نہیں کھل رہا ہے۔" اس نے سوچا "رفیق صاحب کو بھی اس کے سوا کوئی تالا نہیں ملتا تھا۔ ساری کفایت ان کو بس تالے ہی میں کرنی تھی" اس کے بعد اس نے ملکی صنعت کو کوسنا شروع کر دیا۔ "ہمارے صنعت کار صرف چیزوں کی شکلیں بناتے ہیں اور ان کو دکھا کر گاہکوں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض نہیں کہ گھر پہنچ کر وہ گاہک کے کام بھی دیں گی یا نہیں"۔ جھنجھلاہٹ میں طرح طرح کے الفاظ اس کی زبان پر آرہے تھے۔ اس کا غصہ اب اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ اگلا مرحلہ یہ تھا کہ تالا کھولنے کے لئے وہ کنجی کے بجائے ہتھوڑے کا استعمال شروع کر دے۔

اتنے میں اس کے میزبان رفیق صاحب آگئے۔ "کیا تالا نہیں کھل رہا ہے"۔ انھوں نے کنجی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اچھا آپ کنجی غلط لگا رہے تھے۔ اصل میں آج ہی میں نے تالا بدل دیا ہے۔ مگر کنجی چھلے میں ڈالنا بھول گیا۔ اس کی کنجی دوسری ہے"۔ اس کے بعد وہ دوڑ کر دوسری کنجی لائے اور دم بھر میں تالا کھل گیا۔

ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ موجودہ زمانہ نے زندگی کے دروازوں کے تالے بدل دئے ہیں۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ پرانی کنجیوں کا گچھا لئے ہوئے تالوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہیں۔ اور جب پرانی کنجیوں سے نئے تالے نہیں کھلتے تو کبھی تالا بنانے والے پر اور کبھی سارے ماحول پر خفا ہوتے ہیں۔ حالانکہ محض غصہ اور نفرت کی بنا پر ایسا نہیں ہو سکتا کہ پرانی کنجیوں سے نئے تالے کھل جائیں۔

ہمارے تمام قائدین کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق کچھ "اسلام دشمن" تلاش کر رکھے ہیں اور ان مفروضہ دشمنوں کی سازش کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا سبب سمجھتے ہیں۔ مگر خدا کی دنیا میں اس سے زیادہ بے معنی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں ہر شخص اور ہر قوم کو صرف اپنی کوتاہیوں کی سزا ملتی ہے۔ اس دنیا میں ہر حادثہ جو کسی کے ساتھ پیش آتا ہے وہ اس کی اپنی کسی کمزوری کی قیمت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر مصیبتیں زمانہ سے عدم مطابقت کی قیمت ہیں۔ اگر ہم اس عدم مطابقت کو ختم کر دیں تو آپ سے آپ موجودہ حالات ختم ہو جائیں گے۔

واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے دور میں جذباتی تقریریں اور تحریریں، اہلیت کی بنا پر حقوق حاصل کرنے کے دور میں رعایت اور رزرویشن کی باتیں، اکثریتی حکمرانی کے نظام میں اقلیتوں کے لئے قائدانہ رول ادا کرنے کے نعرے، تعمیری استحکام کے ذریعہ اوپر اٹھنے کے دور میں جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ قوم کا مستقبل برآمد کرنے کی کوشش، سماجی بنیادوں کی اہمیت کے زمانہ میں سیاسی سودے بازی کے ذریعہ ترقی کے منصوبے، یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔ یہ ماضی کے معیاروں پر حال کی دنیا سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرنا ہے۔ جو کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ آج کا "نیا تالا" ان "پرانی کنجیوں" سے نہیں کھلتا۔ اس لئے دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا اپنے ظلم اور تعصب کی وجہ سے ہمیں کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آج پوری مسلم قوم ایک قسم کی نفسیاتی مریض ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اس المیہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زمانہ کے تقاضے پورے نہیں کئے اس لئے زمانہ نے بھی ہمیں اپنے اندر جگہ نہیں دی۔ بدلے ہوئے زمانہ میں ہم ایک ردی ہوئی قوم بن کر رہ گئے۔

آزمودہ حل

رابرٹ ملتھوف (Robert Multhoff) کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ اس نے کہا کہ جو شخص تعمیم کو پسند کرتا ہے وہ عموماً جھوٹ بولتا ہے:

He who likes to generalize generally lies.

ایک تنہا واقعہ کو اگر آپ عمومی انداز میں بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ استثنار کو عموم کی حیثیت دے رہے ہیں۔ ایک حادثہ جو کسی اتفاقی سبب سے پیش آیا ہے اس کو سماج کی عام حالت قرار دے رہے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ جھوٹ کی فضا میں رہتا ہے۔ وہ نہ کبھی سچائی کو پاتا اور نہ معاملہ کے سچے حل کو۔

ہمارے بہت سے اخبارات ہیں جن میں آپ کو اس قسم کی سرخیاں پڑھنے کو ملیں گی — ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد، علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد، حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فساد۔ اس قسم کی خبریں صحیح ہونے کے باوجود ہمیشہ غلط ہوتی ہیں۔ وہ آدھی سچائی ہوتی ہیں نہ کہ پوری سچائی۔ کیوں کہ کوئی فساد کبھی پورے ملک یا پورے شہر میں نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پورا ملک یا پورا شہر فرقہ وارانہ فساد کی زد میں آگیا ہے۔

جب بھی کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ نہ سارے ہندستان میں ہوتا اور نہ کسی پورے شہر میں۔ مثلاً اس قسم کے فساد تقریباً سب کے سب ہندستان کے شمالی حصہ میں ہوتے ہیں۔ ہندستان کا جنوبی حصہ ہمیشہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح مثلاً علی گڑھ میں فساد ہوا تو وہ پرانے شہر میں ہوا۔ سول لائن کے علاقہ میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ اسی طرح حیدرآباد کا فساد قدیم حیدرآباد کے علاقہ میں ہوا۔ نیا حیدرآباد اس سے بچا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کی خبریں ہمیشہ "جھوٹ" ہوتی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہمارے قائدین آج تک اس مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کر سکے۔ چونکہ اپنے ذہن کے مطابق وہ "پورے" ملک یا "پورے" شہر میں فساد فرض کئے ہوئے ہیں اس لئے ان کو وہ غیر فساد زدہ حصہ نظر نہیں آتا جہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کی تحقیق کر کے وہ اس کے مطابق فساد زدہ حصہ کو فساد سے بچانے کی تدبیر کر سکیں۔

ایک ہی شہر کے ایک حصہ میں فساد ہو اور اسی شہر کے دوسرے حصہ میں فساد نہ ہو تو یقیناً

یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ فرق کیسے واقع ہوا۔ اس فرق کا راز دریافت کرکے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ محفوظ حصہ کے تجربہ کو غیر محفوظ حصہ میں دہرایا جائے۔ جس طرح ایک حصہ فساد سے بچا ہے اسی طرح دوسرے حصہ کو بھی فساد سے بچایا جائے۔

ہمارے تمام قائدین تعمیم (Generalization) کے جھوٹ میں مبتلا ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ وہ اس نازک مسئلہ کا سچا حل دریافت نہ کر سکے۔

تعمیم سے بچ کر خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان دو ہندستان کا نام ہے۔ اسی طرح علی گڑھ بھی دو علی گڑھ ہے اور حیدرآباد بھی دو حیدرآباد۔ ایک ملک دو ملک کیسے بنا اور ایک شہر دو شہر کیوں کر ہو گیا۔ اسی سوال کے جواب میں یہ راز چھپا ہوا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

ایک مقام کے ایک حصہ میں فساد ہو اور عین اسی زمانہ میں اس مقام کا دوسرا حصہ فساد سے بچا رہے تو ہم کو چاہئے کہ فساد کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے فساد نہ ہونے والے حصہ کا مطالعہ کریں اور وہاں فساد نہ ہونے کے اسباب کو جان کر اسی کو اس دوسرے حصہ میں رائج کریں جہاں فساد ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں یہی فساد کے مسئلہ کے مطالعہ کا فطری طریقہ ہے اور یہی اس مسئلہ کے حل کی آسان ترین تدبیر بھی۔

شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ "دوقومی" سیاست سب سے زیادہ شمالی ہندستان میں چلائی گئی۔ جب کہ جنوبی ہندستان کا علاقہ اس قسم کی تفریقی سیاست سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہندستان میں فرقہ وارانہ کش مکش کی فضا پائی جاتی ہے۔ جب کہ جنوبی ہندستان میں اس قسم کی فضا تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح علی گڑھ کے شہری علاقہ اور سول لائن کے علاقہ میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ شہری علاقہ میں جاہلوں کی اکثریت ہے اور سول لائن میں تمام کے تمام پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ قدیم حیدرآباد اور جدید حیدرآباد میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جدید حیدرآباد میں سب کے سب خوش حال لوگ بستے ہیں اور قدیم حیدرآباد میں کثرت سے غریب لوگ آباد ہیں۔

اس مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے حالات میں فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور کس قسم کے حالات میں وہ نہیں ہوتا۔ اب فسادات کو ختم کرنے کی آزمودہ تدبیر یہ ہے کہ شمالی ہند میں جنوبی ہند کے مانند حالات پیدا کئے جائیں۔ مسلمان اپنی طرف سے ان تمام اسباب کو ختم کر دیں جو دونوں فرقوں میں کش مکش اور تناؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً حقوق کے مطالبے، احتجاجی سیاست اور مسجد اور مندر

کے جھگڑے کھڑے کرنا وغیرہ۔ اسی طرح یہ کیا جائے کہ "قدیم شہر" میں "جدید شہر" کے حالات پیدا کئے جائیں۔ یعنی اقلیتی فرقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جائیں۔ انھیں چیزوں نے ملک کے ایک حصہ میں فساد کو روک رکھا ہے اور یہی چیزیں ملک کے دوسرے حصہ میں بھی فساد کو روک سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی نیا حل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اسی آزمودہ تدبیر کو فساد زدہ علاقہ میں بھی استعمال کریں جو غیر فساد زدہ علاقہ میں آج بھی فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ڈاٹ بنی ہوئی ہے۔

دہلی کے ایک مسلم محلہ میں ایک اردو پوسٹر نظر سے گذرا۔ سرخی یہ تھی :

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے ہندستانی مسلمان سوال کرتے ہیں"

یورپ کے سفر میں ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ ایک پرجوش نوجوان عربی اور انگریزی میں چھپا ہوا ایک کتابچہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ الفاظ درج تھے :

"ہندستان جو مسلمانوں کے لئے عظیم مذبح بن چکا ہے"

ہندستان میں جزئی طور پر ضرور ایسے بعض واقعات ہوئے ہیں جن پر مذکورہ بالا الفاظ صادق آتے ہیں۔ مگر پورے ملک کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ بولنا سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اور جو لوگ خلاف واقعہ بات پر اپنی عمارت کھڑی کرنا چاہیں وہ یقینی طور پر خدا کی مدد نہیں پا سکتے۔

اس طرح سوچنے اور بولنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی کبھی مسئلہ کے صحیح حل تک نہیں پہنچتا۔ "مسئلہ کا حل کیا ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی یہ جانے کہ "مسئلہ کی نوعیت کیا ہے"۔ مسئلہ کی نوعیت کو جانے بغیر مسئلہ کا حل متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ طرز پر سوچنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ مسئلہ کی نوعیت دریافت نہ کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ مسئلہ کا حل پا سکیں۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ طرز کلام آدمی سے حقیقت پسندی چھین لیتا ہے۔ دنیا کا نظام اس کے پیدا کرنے والے نے کامل حقیقت پسندی کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اصول فطرت سے کلی مطابقت ضروری ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ دوسروں پر جھوٹا الزام دینے کو اپنا طریق کار بنائیں وہ یقینی طور پر حقیقت پسندی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں۔

جواب کا صحیح طریقہ

مولانا محمد ہاشم القاسمی نے بتایا کہ وہ ایک مقام پر گئے۔ وہاں ایک مسجد میں انھوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ وہاں بیٹھ گئے۔ اس وقت وہاں تقریباً پندرہ آدمی تھے۔ الرسالہ کا ذکر آیا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: "ہاں میں الرسالہ کو جانتا ہوں۔ وہ تو ایک نیم مذہبی پرچہ ہے اس کو خالص دینی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔"

اس کے بعد انھوں نے باآواز بلند الرسالہ کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ تاہم مولانا قاسمی صاحب برہم نہیں ہوئے۔ انھوں نے خاموشی سے اپنی جیب سے تین روپیہ نکالا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ بازار میں فلاں اسٹال پر الرسالہ فروخت ہو رہا ہے۔ وہاں سے ایک شمارہ لے کر آجاؤ۔ آدمی نے پوچھا کہ کس مہینہ کا شمارہ۔ انھوں نے کہا جس مہینہ کا بھی مل جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جولائی ۱۹۸۲ کا شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اب مولانا قاسمی نے کہا: دیکھئے یہ جولائی ۱۹۸۲ کا الرسالہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے اوراق کھول کھول کر ایک ایک سرخی پڑھنی شروع کی اور مذکورہ بزرگ سے پوچھا کہ بتائیے ان میں سے کون سا مضمون آپ کے خیال میں نیم مذہبی ہے۔ عنوانات یہ تھے: جنت کا دروازہ، روزہ کی حقیقت ہر طرف فریب، شناختی کارڈ کے بغیر۔

"شناختی کارڈ کے بغیر" کے الفاظ سن کر مذکورہ بزرگ فوراً بولے۔ اس کو دیکھئے یہ نیم مذہبی نہیں تو اور کیا ہے۔ شناختی کارڈ کا دین اور مذہب سے کیا تعلق۔

مولانا قاسمی نے کہا کہ آپ کے بیان کے مطابق یہ مضمون یقینی طور پر نیم مذہبی ہے۔ اب میں اس مضمون کو پڑھتا ہوں۔ آپ بھی سنیں اور سب حاضرین سنیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں۔

اس مضمون کا تقریباً نصف حصہ ایک واقعہ پر مشتمل ہے۔ مولانا قاسمی جب نصف تک پہنچے تو مذکورہ بزرگ نے پھر بولنا شروع کیا۔ مولانا قاسمی نے کہا: آپ تھوڑی دیر رکئے۔ میں پورا مضمون پڑھ دوں۔ اس کے بعد آپ تبصرہ کریں۔ اس کے بعد انھوں نے اگلی سطریں پڑھنی شروع کیں تو وہ سراسر آخرت سے متعلق تھا، اب جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے مذکورہ بزرگ ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ جب مضمون ختم ہوا تو وہ بالکل لاجواب ہو چکے تھے۔ تمام حاضرین کہہ اٹھے کہ یہ تو سراسر مذہبی بات ہے۔ اور نہایت موثر انداز میں ہے۔ پھر اس پر اعتراض کیا۔

انتقام نہیں

ایک صاحب ٹرانسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی جس کا لائسنس رسمی طور پر دوسرے کے نام تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس آدمی کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ کاغذ میں قانونی اندراج سے فائدہ اٹھا کر گاڑی پر قبضہ کرلے یا اس کے معاوضہ میں ان سے کوئی بڑی رقم حاصل کرے۔ ٹرانسپورٹ کے مالک کے سامنے جب یہ بات آئی تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے اس "دوست" کا جانی دشمن ہوگیا۔

اب اس کا ذہن ہر وقت ایک ہی سوچ میں رہتا۔ وہ یہ کہ اس شخص کو کس طرح مروایا جائے۔ انتقام کے جذبہ نے اس کے ذہن کو جرائم کا کارخانہ بنا دیا۔ اب اس کو نہ اپنے کاروبار کی ترقی کی فکر تھی نہ اپنے گھر کو بنانے کی۔ ساری فکر اس بات کی تھی کہ مذکورہ شخص کو کسی نہ کسی طرح ہلاک کردیا جائے۔ اسی حال میں چھ ماہ گذر گئے۔ بالآخر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ وہ اتفاقاً ایک مقام پر گیا ہوا تھا۔ ایک سڑک سے گذرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ آوازیں آئیں۔ اس کو محسوس ہوا کہ یہاں کوئی تقریر ہو رہی ہے۔ وہ جلسہ گاہ کی طرف مڑ گیا اور وہاں بیٹھ کر تقریر سننے لگا۔ تقریر کرنے والا کہہ رہا تھا:

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔

تقریر کی سادگی نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ انتہائی غور کے ساتھ مقرر کی باتیں سنتا رہا جو بار بار مختلف مثالوں کے ذریعہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر رہا تھا۔ تقریر کے بعد جب وہ جلسہ گاہ سے اٹھا تو وہ دوسرا انسان بن چکا تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ انتقام کے ذہن کو ختم کردے گا اور مذکورہ شخص کے معاملہ کو خدا کے حوالہ کر کے اپنے کاروبار کی ترقی میں لگ جائے گا۔

ٹرانسپورٹ کے مالک کو اب تک کام کرنے کا صرف "تخریبی ڈھانچہ" معلوم تھا۔ اب انھوں نے کام کرنے کا "تعمیری ڈھانچہ" دریافت کرلیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وہی ایک انداز نہیں ہے جس پر دوسرے اکثر لوگ چل رہے ہیں۔ کام کرنے کا ایک اور انداز بھی ہے۔ اور وہ ہے —— دوسرے کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے پیچھے دوڑنا۔

مذکورہ شخص نے اب اسی دوسرے طریقے کو پکڑ لیا۔ انھوں نے ۶ ستمبر ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں کہا کہ " اب وہ اپنے کو زیادہ پرسکون بھی پاتے ہیں اور زیادہ کامیاب بھی "

بدعنوانی

بمبئی میں ایک کئی منزلہ عمارت بنائی گئی۔ اس کا نام "آکاشں دیپ" رکھا گیا۔ مگر جب وہ بن کر تیار ہوئی تو اچانک گر پڑی۔ بتایا جاتا ہے کہ گرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تعمیر میں سمنٹ کا جز مقررہ مقدار سے کم استعمال کیا گیا تھا۔

ایک ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر نے اس سلسلے میں اپنا بیان دیتے ہوئے کہا:

> RCC construction is a scientific process which is excellent in the hands of qualified and experienced people, but dangerous if managed by incompetent engineers and contractors.

آر سی سی تعمیر ایک سائنسی طریقہ ہے جو بہت عمدہ ہے جب کہ وہ لائق اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھ میں ہو مگر وہ اس وقت خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کو استعمال کرنے والے نااہل انجنیئر اور ٹھیکہ دار ہوں۔
(ٹائمس آف انڈیا ۴ ستمبر ۱۹۸۳)

بظاہر یہ ایک صحیح اور خوب صورت بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ یہ مغالطہ اس وقت کھل جاتا ہے جب کہ ہم نااہل (Incompetent) کی جگہ بدعنوان (Corrupt) کا لفظ رکھ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے مسائل لوگوں کی حرص اور بدعنوانی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ فنی عدم مہارت کی وجہ سے۔

بھاکرڑا ڈیم ہندستان کا اعلیٰ ترین سرکاری منصوبہ تھا۔ اس کی تعمیر میں ملک کے بہترین انجنیئر لگائے گئے۔ مگر جب وہ بن کر تیار ہوا تو اس کی دیوار میں شگاف ہو گیا جس کی تعمیر پر دوبارہ کروڑوں روپیہ لگانا پڑا۔ اس قسم کے واقعات ہر روز ہمارے ملک میں ہو رہے ہیں۔ یہ سب کام ہمیشہ فنی ماہرین کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ سڑکیں بننے کے بعد جلد ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ عمارتیں تیار ہونے کے ساتھ ہی قابل مرمت ہو جاتی ہیں۔ منصوبے تکمیل کو پہنچ کر غیر مکمل نظر آنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے تمام واقعات کی وجہ بدعنوانی ہے نہ کہ فنی مہارت کی کمی۔

بدعنوانی ایک نفسیاتی خرابی ہے اور فنی مہارت میں کمی ایک ٹکنکل خرابی۔ نفسیاتی خرابی کو ٹکنکل اصلاح کے ذریعہ دور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں واقعتاً ایک بہتر سماج بنے تو افراد قوم کی نفسیاتی اصلاح کرنی ہوگی۔ صرف ٹکنکل کورس میں اضافہ سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

مستقل ارادہ

کسی مفکر کا قول ہے: "لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادے کی" یہ ایک واقعہ ہے کہ اکثر لوگوں کے اندر صلاحیت پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ وہ صرف اس لئے نہیں اٹھا پاتے کہ وہ استقلال کے ساتھ دیر تک جدوجہد نہیں کر سکتے۔ اور کسی واقعی کامیابی کے لئے لمبی جدوجہد فیصلہ کن طور پر ضروری ہے۔ اگر آپ اپنی کوششوں کا کوئی ٹھوس اور مفید نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے دن یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو لمبی مدت تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر آپ کے اندر انتظار کی طاقت نہیں ہے تو آپ کو اپنے لئے کسی پائدار کامیابی کی امید بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ زندگی کا راز ایک لفظ میں یہ ہے ـــــ جتنا زیادہ انتظار اتنی ہی زیادہ ترقی۔

قومی زندگی کی "تعمیر" تھوڑے سے وقت میں بھی ہو سکتی ہے اور اس کے لئے زیادہ مدت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ کس قسم کی قومیت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر قوم کے اندر فوری جوش پیدا کرنا مقصود ہے۔ اگر محض منفی نوعیت کے کسی وقتی ابال کو آپ مقصد سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اگر عوامی نفسیات کو اپیل کرنے والے نعرے لگا کر تھوڑی دیر کے لئے ایک بھیڑ جمع کر لینے کو آپ کام سمجھتے ہیں۔ اگر جلسوں کی دھوم کا نام آپ کے نزدیک قوم کی تعمیر ہے تو اس قسم کی قومی تعمیر، اگر اتفاق سے اس کے حالات فراہم ہو گئے ہوں، آناً فاناً ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم کی تعمیر سے زیادہ قیادت کی تعمیر ہے۔ کیونکہ اس طرح کے شور و شر سے وقتی طور پر کچھ قائدین کو تو ضرور فائدہ ہو جاتا ہے۔ مگر انسانیت کے اس مجموعی تسلسل کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس کو قوم یا ملت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس قسم کے طریقے گویا ایک قسم کا استحصال ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھا کر وقتی طور پر کچھ لوگ اپنی قیادت جما لیتے ہیں۔ یہ سستی لیڈری حاصل کرنے کا ایک کامیاب نسخہ ہے۔ جس کو سطحی قسم کے لوگ نادانی کی بنا پر یا ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اگر ہم واقعی ملت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم شاہ بلوط کا درخت اگانے اٹھے ہیں نہ کہ ککڑی کی بیل جمانے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو لازمی طور پر لمبا منصوبہ چاہتا ہے۔ تھوڑی مدت میں اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی لیڈر ایسے نعرے لگاتا ہے تو وہ یا تو اس کی سادہ لوحی کی دلیل ہے یا اس کی استحصالی ذہنیت کی۔ اور اگر کوئی قوم ایسی ہے جو لمبے انتظار کے بغیر اپنی تعمیر و ترقی کا قلعہ بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہے تو اس کو جان لینا چاہیے کہ ایسے قلعے صرف ذہنوں میں بنتے ہیں، عالم واقعہ میں نہیں۔

میں پڑھ کر پڑھاؤں گا

فادر ہنری ہراس (۱۹۵۶- ۱۸۸۹) ایک اسپینی مسیحی تھے۔ وہ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸ نومبر ۱۹۲۲ کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندستان کی زمین نے ان کو متاثر کیا۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کے تبلیغی حوصلہ کے لئے اس ملک میں کام کا اچھا میدان ہے۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ یہاں رہ کر اپنا تبلیغی کام انجام دیں گے۔

مگر ہندستان ان کا وطن نہیں تھا۔ کام سے پہلے ضروری تھا کہ یہاں ان کے لئے قیام کی کوئی بنیاد ہو۔ یہاں اپنی جگہ بنا کر ہی وہ یہاں کی آبادی میں اپنے تبلیغی کام کو جاری رکھ سکتے تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ ہندستان میں وہ بحیثیت معلم کے قیام کریں گے اور اس کے بعد کالج میں اور کالج کے باہر اپنے لئے کام کی تدبیر کریں گے۔ بمبئی کا ہراس انسٹی ٹیوٹ انھیں کی یادگار ہے۔

فادر ہراس (Fr. Henry Heras) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے پرنسپل سے ملے۔ وہ ایک تاریخ داں تھے۔ انھوں نے اپنے ملک سے تاریخ میں ڈگری لی تھی۔ پرنسپل نے ان کے کاغذات دیکھ کر پوچھا: "آپ یہاں کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے" فادر ہراس نے فوراً جواب دیا "ہندستانی تاریخ"۔ پرنسپل کا اگلا سوال تھا: ہندستانی تاریخ میں آپ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "کچھ نہیں"۔ "پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے" پرنسپل نے پوچھا۔ فادر ہراس کا جواب تھا: I shall study it.

میں ہندستانی تاریخ کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو تیار کروں گا۔ پھر اس کو پڑھاؤں گا۔

فادر ہراس جانتے تھے کہ معلمی کا کام وہ بطور پیشہ نہیں اختیار کر رہے ہیں کہ یورپ کی تاریخ یا جو مضمون بھی وہ چاہیں پڑھائیں اور مہینہ کے آخر میں تنخواہ لے کر مطمئن ہو جائیں۔ ان کے لئے معلمی کا کام ایک خاص مقصد کی خاطر تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے تبلیغی کام کے لئے مناسب بنیاد فراہم کریں اور اس مقصد کے اعتبار سے ان کے لئے "ہندستانی" تاریخ سب سے زیادہ موزوں مضمون تھا۔ وہ ہندستان میں تھے اس لئے ہندستانی تاریخ کے معلم بن کر وہ زیادہ بہتر طور پر یہاں کے نوجوانوں میں اپنے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان کی تاریخ سے ناآشنا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے مضمون کے لئے ہندستانی تاریخ کو پسند کیا۔

انھوں نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ نہ صرف اس مضمون کے اچھے معلم بن گئے بلکہ ہندستانی تاریخ میں سر جدو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے درجہ کے مورخ کی حیثیت حاصل کر لی۔

اسی خرچ سے

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ ان کی زندگی ایک تصنیفی ادارہ میں گذری۔ وہ بہت سادہ طور پر رہتے تھے۔ اپنی مختصر آمدنی میں بھی وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچت کر لیا کرتے تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کی انھوں نے شادی کی تو شادی میں کچھ خرچ نہیں کیا۔ ایک نوجوان سے سادہ طور پر نکاح پڑھایا اور اس کے بعد لڑکی کو رخصت کر دیا۔ البتہ انھوں نے رخصت کرتے ہوئے اپنی لڑکی اور داماد کو ایک چک دیا۔ یہ چک دس ہزار روپے کا تھا۔ انھوں نے کہا: یہی میری زندگی بھر کی بچت ہے جو بینک میں جمع تھی۔ اس رقم کو میں شادی کے رسوم میں بھی خرچ کر سکتا تھا۔ تاہم اس کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ پسند آیا کہ میں اس کو نقد تم لوگوں کے حوالے کر دوں۔ تم لوگ اسے سنبھالو اور اس کو اپنی زندگی کی تعمیر میں استعمال کرو۔"

لڑکی اور داماد نے باہم مشورہ کیا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ابتدا میں ان کو کافی محنت کرنی پڑی۔ بعض اوقات بڑے سخت مراحل سامنے آئے۔ مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کاروبار پر جمے رہے۔ بالآخر حالات بدلنا شروع ہوئے۔ مذکورہ "دس ہزار" روپیہ میں برکت ہوئی اور وہ لوگ چند سال کے بعد کافی ترقی کر گئے۔ اب وہ اپنے مقام پر ایک باعزت اور خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔

شادی آدمی کی زندگی کا ایک بے حد سنجیدہ واقعہ ہے۔ وہ دھوم مچانے کا دن نہیں بلکہ زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس کرنے کا دن ہے۔ اس دن ایک مرد اور ایک عورت اپنے کو گاڑھے اقرار (نساء ۲۱) میں باندھتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ نکاح کی تقریب سادہ ہو، وہ فضول نمائشوں سے بالکل پاک ہو۔ اور اگر کسی کو خرچ ہی کرنا ہے تو اس خرچ کی ایک اچھی صورت وہ ہے جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اگر ہمارے درمیان اس قسم کا رواج پڑ جائے تو شادی قومی تعمیر کے پروگرام کا ایک اہم جزء بن جائے۔ ہر خاندان میں نہایت خاموشی کے ساتھ ترقی کا سلسلہ چل پڑے۔ قوم کے اربوں روپے جو ہر سال چند دن کے تماشوں میں ضائع ہو جاتے ہیں، قوم کی تعمیر کا ایک مستحکم ذریعہ بن جائیں۔ وہ قومی اقتصادیات کے منصوبہ کا جزء بن جائیں۔ اور قوم اقتصادی حیثیت سے اوپر اٹھ جائے تو یہ صرف ایک اقتصادی واقعہ نہیں ہوگا بلکہ بے شمار پہلوؤں سے وہ قوم کی ترقی کے لئے مفید ہوگا ——— یہ ایک مزید فائدہ ہے مگر مزید خرچ کے بغیر۔

ناقابل توجیہہ

انسانی دماغ اتنا زیادہ پیچیدہ ہے کہ بے شمار تحقیقات کے باوجود آج بھی ہم اس کے بارہ میں بہت کم جانتے ہیں۔ ایک محقق کے الفاظ میں، دماغ کے بارہ میں ہمارا علم جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کتنا کم جانتے ہیں اور ابھی کتنا زیادہ جاننا باقی ہے :

The more we know the more we realize how little we know and how much more we need to know.

تحقیقات بتاتی ہیں کہ آئن سٹائن جیسے عبقری انسان جنھوں نے بظاہر اپنی ذہنی صلاحیت کو آخری حد تک استعمال کیا، انھوں نے بھی حقیقۃً اپنے دماغ (Brain) کا بہت چھوٹا سا حصہ استعمال کیا۔ ان کے دماغ کا بیشتر حصہ غیر استعمال شدہ رہا، یہاں تک کہ ان کی موت آگئی۔ اس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت نے کیوں اور کیسے ارتقائی عمل کے ذریعہ اس معجزاتی چیز کو پیدا کیا جس کو دماغ کہا جاتا ہے :

Why and how then has nature produced through the evolutionary process this marvellous thing called the human brain.

کہا جاتا ہے کہ ضرورت اور استعمال سے چیزیں ترقی کرتی ہیں۔ مگر جو دماغ سرے سے استعمال ہی نہیں ہوا وہ کیسے وجود میں آیا۔ ڈارونزم کا کہنا ہے کہ جسمانی اعضاء اور دماغ پہلے سے پیدا شدہ موجود نہیں تھے۔ وہ حالات کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی کوشش کے دوران وجود میں آئے ہیں :

The human organism, including the brain, has developed in response to the challenges it has faced in its effort to survive.

مگر سوال یہ ہے کہ دماغ کے جو حصے سرے سے کبھی استعمال ہی نہیں ہوئے وہ آخر کیسے وجود میں آکر ترقی کرنے لگے۔ جب "استعمال" چیزوں کا خالق ہے تو "عدم استعمال" نے کس طرح چیزوں کو پیدا کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر استعمال شدہ دماغ کا ہر انسان کے ساتھ پیدا ہونا اور مسلسل موجود رہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ خارج سے انسان کو دئے جا رہے ہیں نہ کہ انسانی کوشش سے اس کو حاصل ہو رہے ہیں۔ غیر استعمالی دماغ کی موجودگی ڈارون کے اس نظریہ کی نفی کر رہی ہے کہ فطرت میں بقاء اصلح (Survival of the fittest) اور انتخابی طریق عمل (Selection process) پایا جاتا ہے۔

غلط تعارف

قرآن کی تعلیمات پر ہمارے ادارہ کی ایک انگریزی کتاب دارالسلطنت کے ایک انگریزی پریس میں چھپ رہی تھی۔ ہمارا آدمی ایک بار پریس گیا تو اس کے غیر مسلم مشین مین نے پوچھا: یہ کیسی کتاب ہے۔ آدمی نے بتایا کہ یہ قرآنی تعلیمات کے بارہ میں ہے۔ مشین مین نے دوبارہ کہا: پھر تو یہ مارکاٹ سکھانے والی کتاب ہوگی۔ کیوں کہ تمھارے قرآن میں یہی سب چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مسلمان بزرگ نے اس واقعہ کو سنا تو فرمایا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ نہیں بلکہ پراپر انڈرسٹینڈنگ ہے۔ قرآن بلاشبہ مارکاٹ کی کتاب نہیں مگر ہم نے اپنے قول و عمل سے دنیا کے سامنے جس اسلام کا تعارف کرایا ہے وہ یہی ہے۔ اگر ایک غیر مسلم اسلام کے بارہ میں کتاب لکھے اور اس کا نام خنجر اسلام (Da[illegible]er of Isl[illegible]) رکھ دے تو مسلمان فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ مگر خود ان کے مشہور ترین اسلامی مفکر کا حال یہ ہے کہ وہ فخر کے ساتھ کہتا ہے:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں   خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ایسی حالت میں دوسرے لوگ کیا کریں۔ کیا وہ آپ کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ لیں:

پھولوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں   پھولوں کا گلستاں ہے قومی نشاں ہمارا

مسلمانوں میں جب بگاڑ آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے اندر احساس فخر باقی رہتا ہے اور احساس ذمہ داری ان سے نکل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں حق ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ مگر دوسروں کو ان پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ ہر خوبی کا مستحق اپنے کو سمجھ لیتے ہیں اور خرابی کا مستحق دوسروں کو۔

موجودہ زمانہ میں ایران اور پاکستان اپنے کو اسلام کا سب سے بڑا علم بردار بتاتے ہیں۔ ہمارے قائدین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور "ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے"۔ مگر ان ملکوں میں اسلام کا جو سب سے بڑا عملی نمونہ دکھایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کو مارو، انھیں کوڑے لگاؤ، ان سے ان کی آزادیاں چھین لو۔ مفروضہ دشمنوں کے خلاف لامتناہی جنگ جاری رکھو۔ پھر دوسرے لوگوں سے آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کریں کہ اسلامی ملکوں سے آنے والی خبروں کو جب وہ پڑھیں تو اپنے ذہن میں اس کے معنی بدل لیا کریں۔ وہ گولی کو پھول کے معنی میں لے لیں اور کوڑے کو مصافحہ کرنے کے معنی میں۔

امتحان

ایک ایٹم بم نے ۱۹۴۵ میں ہیروشیما کے پورے شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ اب ہیروشیما ٹائپ جیسے ایک ملین تباہ کن طاقت کے ہتھیار انسان کے قبضہ میں ہیں۔ گویا آج انسان اس پوزیشن میں ہے کہ دنیا کے تمام شہروں اور تمام قابل ذکر آبادیوں کو صرف چند دن میں تباہ و برباد کر دے۔

یہ ہتھیار کیا ہیں۔ وہ دراصل قدرت کے وسائل کا غلط استعمال (Misuse) ہیں۔ تلوار لوہے کا غلط استعمال ہے اور ایٹم بم نیوکلیر انرجی کا غلط استعمال۔

جن چیزوں سے ہتھیار بنائے جاتے ہیں وہ کروروں سال سے "نیچر" کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان سے کوئی تباہی پیدا نہیں ہوئی۔ مگر یہ چیزیں جب انسان کے قبضہ میں آئیں تو وہ اچانک تباہ کن بن گئیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "نیچر" کو آزادی حاصل نہیں۔ جب کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ساری خرابیاں انسانی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں:

What philosophers call as 'problem of evil'
is simply a misuse of human freedom.

موجودہ زمانہ کا انقلاب "آزادئ انسانی کا انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اب ہمیں ایک اور انقلاب "پابندئ انسانی کا انقلاب" لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو سکے۔ انسان کو موجودہ دنیا میں آزادانہ انتخاب کا جو موقع ملا ہوا ہے وہ امتحان ہے نہ کہ انسان کا حق۔ انسان اگر اپنے انتخاب (Choice) کو صحیح رخ پر استعمال کرے گا تو وہ کامیاب ہوگا اور اگر وہ اس کو غلط رخ پر استعمال کرے گا تو اس کے لئے ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

نیچر کے کنٹرول کی صورت میں وسائل کا درست رہنا اور انسان کے کنٹرول کی صورت میں بگاڑ آ جانا بتاتا ہے کہ دنیا کے نظام کو درست رکھنے کی صحیح تدبیر کیا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ انسان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ بھی ان وسائل کا اسی طریقہ سے استعمال کرے جس طریقہ سے نیچر ان کو استعمال کرتی ہے۔ نیچر کے نمونہ کو انسانی زندگی میں قائم کرنا ہی اصل کام ہے، فرد کے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی۔

حقیقت پسندی

باغ لگانے کا کام "باغ کانفرنس" سے شروع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک ایک پودے کو وہ حالات فراہم کیے جائیں جن میں وہ اپنی ذاتی اپجاؤ کی صلاحیت کو بروئے کار لائے اور درخت کی صورت میں ترقی کر کے باغ کے مجموعہ کا جزء بن جائے۔

یہی طریقہ ملت کی تعمیر کا بھی ہے۔ ملت کی تعمیر دراصل افراد کی تعمیر کا نام ہے۔ ایک ایک فرد کو باشعور بنانا، ایک ایک فرد کی چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو بیدار کر کے اس کو حقیقی انسان کے درجہ پر پہنچانا، ایک ایک فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرنا کہ وہ دوسرے بھائیوں کے لئے مسئلہ بنے بغیر اپنے ترقیاتی امکانات کو ظہور میں لانے کی جدوجہد کرے۔ اسی قسم کے عمل کا نام ملت کی تعمیر ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بے فائدہ شور وغل ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کے لئے بے روک ٹوک مواقع کھلے ہوئے ہوں اور میدان میں اس کا کوئی حریف موجود نہ ہو۔ ایسا نہ کبھی اس زمین پر کسی کے لئے ہوا اور نہ آج کسی کے لئے ایسا ہو سکتا ہے۔ زندگی حقیقۃً رکاوٹوں کے درمیان سے اپنے لئے راستہ نکالنے کا نام ہے نہ کہ رکاوٹوں کی غیر موجودگی میں بے خوف وخطر دوڑنے کا۔

تاریخ کا مطالعہ جس طرح یہ بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا آغاز ہمیشہ رکاوٹوں اور مشکلوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، اسی طرح تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ رکاوٹیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، ہمیشہ آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ کھلا ہوتا ہے جس سے چل کر وہ اپنی منزل پر پہنچ سکے۔ مگر یہ راستہ انھیں لوگوں کے لئے ہے جو راستہ کے بند مقامات پر سر نہ ٹکرائیں بلکہ دوسرے گوشوں میں اپنے لئے کوئی "درہ" تلاش کر کے آگے بڑھ جائیں۔

پھر تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ حادثہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی تلافی کی صورت بھی انسان کے لئے ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی آفت یا حادثہ انسان کے لئے اس امکان کو ختم نہیں کرتا کہ وہ دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ کے ساتھ اپنے عمل کا آغاز کرے اور کھوئی ہوئی چیز کو دوبارہ نئے انداز سے حاصل کر لے۔

جو کچھ کسی دوسرے انسان کے پاس ہے وہی آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اس راز کو جان لیں کہ اس دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے حقیقت پسندانہ جدوجہد سے ملتا ہے نہ تمناؤں اور خوش خیالیوں سے۔

نماز ابدی فلاح کا ربانی نسخہ ہے۔ مگر نماز پڑھنے والے اس کو رسمی پرستش سمجھتے ہیں اور نماز نہ پڑھنے والے اس کو رسمی بوجھ خیال کرتے ہیں ۔

پانچ نمازوں
کا حکم
قرآن میں

نماز کی ادائگی میں کوتاہ ہونا بے عملی ہے اور نماز کے حکم کو بدلنا سرکشی

نماز کا اصل مقصد اللہ کی یاد ہے۔ مگر اس کا نظام اتنی حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے نہایت جامعیت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ نماز اتحاد اور اجتماعیت کا سبق ہے۔ وہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ ہمارے اوقات کو منظم کرتی ہے۔ وہ ہلکی جسمانی ورزش کا فائدہ دیتی ہے۔ وہ بار بار ہماری صفائی کرتی رہتی ہے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ہر قسم کی روحانی اور جسمانی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمان اگر حقیقی شعور کے ساتھ نماز پر قائم ہو جائیں تو ان کی دنیا بدل جائے اور وہی ان کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہو جائے۔

فرض نمازوں کا پانچ ہونا روایات سے بتواتر ثابت ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دوسری کتب حدیث میں کثرت سے ایسی روایات ہیں جن میں الصلوات الخمس کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں جو مخصوص اوقات میں مقرر کی گئی ہیں۔ تاہم قرآن میں نماز کی بے حد تاکید کے باوجود "پانچ" کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ فرض نمازوں کی تعداد پانچ نہیں ہے بلکہ تین یا اس سے کم ہے۔ وہ اولاً حدیث کی حجیت کا انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق پانچ وقت نماز ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر یہ محض دھوکا ہے۔ اگر کوئی شخص سنجیدہ ہو اور فی الواقع مسئلہ کو سمجھنا چاہتا ہو تو قرآن سے بھی بلا اشتباہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور مقررہ وقت پر ان کی ادائگی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت پر غور کیجئے۔

حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ (بقرہ ۲۳۸)   پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی

جملہ کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اس آیت میں صلاۃ وسطیٰ کا لفظ جس نماز کے لئے آیا ہے وہ صلوات سے علیحدہ نماز ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "نمازوں" کی پابندی کرو اور اسی کے ساتھ اس نماز کی جس کا وقت "نمازوں" کے بیچ میں آتا ہے۔ صلوٰات جمع کا لفظ ہے جو عربی قواعد کے مطابق کم از کم تین نمازوں کے لئے ہے۔ مگر استعمال بتاتا ہے

کہ یہاں اس سے تین سے زیادہ نمازیں مراد لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ تین کے عدد میں کوئی چوتھی چیز رکھی جائے تو وہ اس کا "بیچ" نہیں بن سکتی۔ کم سے کم عدد جو یہاں صلوات سے مراد ہو سکتا ہے وہ چار ہے۔ چار کا عدد لینے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایک اور نماز اُس میں اِس طرح شامل کی جائے کہ وہ اُس کا بیچ بن جائے۔ گویا صلوٰۃ وسطیٰ وہ بیچ کی نماز ہے جس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ باعتبار مفہوم آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ــــــــــــ

"بیچ کی نماز کی پابندی کرو۔ اور بیچ کی نماز سے پہلے دو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کے بعد دو نمازوں کی۔" اس سے صاف طور پر یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دو نمازیں مقرر کی گئی ہیں اور پھر دن میں دو نمازیں۔ اور ان کے بیچ میں ایک نماز ہے۔ رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر اور بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس طرح کل پانچ نمازیں ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشۂ ذیل:



پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو اس نماز کی جو نمازوں کے بیچ میں ہے (قرآن)

پھر یہ بات بھی قرآن میں بالکل واضح ہے کہ نماز اہل ایمان پر معین اوقات کے ساتھ فرض کی گئی ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا، نساء ۱۰۳) اس سلسلے میں جو پانچ اوقات حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، ٹھیک وہی اوقات خود قرآن سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ سورج نکلنے سے پہلے (قبل طلوع الشمس، طٰہٰ ۱۳۰) فجر

۲۔ دوپہر ڈھلنے کے وقت (لدلوک الشمس، بنی اسرائیل ۷۸) ظہر

۳۔ غروب آفتاب سے پہلے (وقبل غروبہا، طٰہٰ ۱۳۰) عصر

۴۔ جب شام ہوتی ہے حین تمسون، روم ۱۷) مغرب

۵۔ جب رات تاریک ہو جائے (الی غسق اللیل، بنی اسرائیل ۷۸) عشاء

اس طرح قرآن سے پانچ نمازیں مع تعیین اوقات ثابت ہو جاتی ہیں۔

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، وہ ایسے شخص کے لئے بالکل کافی ہیں جو حقیقۃً بات کو سمجھنا چاہتا ہو اور اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ جب وہ اللہ کے یہاں پہنچے تو اللہ اس سے راضی ہو جائے۔ مگر جو لوگ بحث و جدال کی سطح پر ہیں ان کو کسی بھی دلیل سے چپ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسی وقت چپ ہوں گے جب کہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور ان سے بولنے کی مہلت چھین لے۔

عظیم خاموشی

ویگا (Vega) ایک ستارہ ہے جو زمین سے ۲۶ سال نور کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حال میں دریافت ہوا ہے کہ اس کے گرد سیارے بن رہے ہیں۔ یہ دریافت سائنس دانوں کے لئے بے حد دلچسپی کی چیز ہے کیوں کہ اس سے ان کے اس نظریہ کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ "زمین" سیاراتی نظام کا ایک ارتقائی مرحلہ ہے۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دوسرا اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ علما رفلکیات کے نزدیک اکثر ستاروں کے گرد سیارے (Planets) ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۵۰۰۰ ملین سورج (ستارے) کے گرد ایسے سیارے موجود ہیں جن کی عمر ہماری زمین سے دگنا ہے۔ مذکورہ نظریہ کے مطابق ان سیاروں پر اعلیٰ ترقی یافتہ مشینی تہذیب (Super-advanced technological civilisation) پائی جانی چاہئے۔ جب کہ یہ سیارے چٹانوں اور گیس اور گرد کے سوا کچھ نہیں۔

انتہائی طاقت ور دوربینوں سے کائنات میں بہت دور تک نہایت توجہ سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ مخصوص ریڈیو کے ذریعہ کائناتی تہذیبوں کے سگنل سننے کی کوشش بہت بڑے پیمانہ پر کی گئی ہے۔ مگر اب تک زمین کے سوا کسی اور سیارہ پر کسی تہذیب کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پروفیسر گلن ڈیوڈ برن (Glen David Brin) نے اس سلسلہ میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں وہ اس صورت حال کو عظیم خاموشی (Great Silence) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس موضوع پر موجودہ زمانہ میں بے پناہ سرمایہ خرچ کیا گیا ہے۔ نہایت اعلیٰ دماغ اس کی تحقیق میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی تک ادنیٰ درجہ میں بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ اب سائنس داں اس سوال سے دوچار ہیں کہ کیا ہم اس کہکشاں میں اکیلے ہیں:

Are we alone in the galaxy.

دوسرے سیاروں پر تہذیب نہ ہونے کے بارہ میں مختلف قیاسی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ ایک زیادہ عام توجیہہ یہ ہے کہ تہذیبیں جب جوہری ہتھیاروں کی دریافت تک پہنچتی ہیں تو خود اپنے آپ کو فنا کر لیتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے۔ کیوں کہ اب تک مختلف کہکشاؤں میں سے کسی کہکشاں میں حال یا ماضی کی کسی جوہری جنگ کا سراغ نہیں ملا (ہندستان ٹائمس ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳)

زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر اعلیٰ تہذیب کی تلاش در اصل کائناتی توجیہہ کی تلاش ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مذہبی خدا کے بجائے سائنسی خدا کی تلاش ہے۔ اس قسم کی تلاش ہمیشہ "عظیم خاموشی" ہی پر ختم ہوگی۔ کیوں کہ وہاں خاموشی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں۔

تہذیب انسانی کا راز یا کائنات کی توجیہہ انسان اور کائنات کے خالق نے پیغمبروں پر الہام کیا ہے۔ اور پیغمبر کے کلام ہی میں ہم اس کا صحیح جواب پا سکتے ہیں۔ اس کے سوا جہاں بھی اس کو تلاش کیا جائے گا وہ صرف وقت اور قوت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

کائناتی واقعات کی توجیہہ کی تلاش خود یہ ثابت کرتی ہے کہ جو واقعات ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں وہ بذات خود اپنی توجیہہ کے لئے کافی نہیں۔ کائناتی واقعات کی توجیہہ کے لئے ہمیں ان واقعات کے ماورا کوئی چیز درکار ہے۔ کسی ماورا چیز کی دریافت کئے بغیر معلوم واقعات ہمارے لئے غیر توجیہہ شدہ بنے رہیں گے۔

اس کے ساتھ اس دوسری حقیقت کو ملا لیجئے کہ ہزاروں سال کی فلسفیانہ تلاش کے باوجود آج تک اس توجیہہ کی دریافت نہ ہو سکی۔ اس سے یہ قرینہ حاصل ہوتا ہے کہ فلسفیانہ یا غیر مذہبی نوعیت کی توجیہہ یہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔

اب ہمارے لئے دوسرا بدل صرف مذہبی یا پیغمبرانہ توجیہہ کا رہ جاتا ہے۔ پیغمبر پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک زندہ خالق ہے جس نے اپنے ذاتی ارادہ اور شعور کے تحت اس کو پیدا کیا ہے اور وہی اپنے ارادے کے تحت اس کو چلا رہا ہے۔

پیغمبروں کے اس بیان کو جب کائنات کے معلوم واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو تمام واقعات خاموش زبان میں اس کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک زندہ کائنات کی توجیہہ ایک زندہ حقیقت ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہی واقعہ پیغمبروں کے بیان کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں "عظیم خاموشی" نہیں بلکہ عظیم پکار ہے۔ مگر اس عظیم پکار کو وہی سن سکتا ہے جو اپنے سر کے ساتھ کان رکھتا ہو۔ چاند کو روشن کرنے کے سورج چاہئے۔ اسی طرح سورج کو روشن کرنے کے لئے ایک عظیم تر سورج درکار ہے۔ بارش کو برسانے کے لئے سمندر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح سمندر کا وجود تقاضا کرتا ہے کہ یہاں ایک اور بڑا سمندر ہو۔ یہ واقعات جس کو دلیل نظر نہ آئیں اس کو اپنی عقل پر شبہہ کرنا چاہئے نہ کہ خدا پر۔

مارکسی اشتراکیت

انسان اپنے آپ کو ایک وسیع اور عظیم کائنات میں پاتا ہے جس کا وہ بے حد حقیر حصہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کائنات سے الگ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ اپنے بارہ میں اس سے الگ ہو کر سوچ بھی نہیں سکتا۔ قدرتی طور پر انسان یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے اور کائنات کے درمیان تعلق کو دریافت کرے۔ وہ کائنات سے اپنا صحیح رشتہ قائم کرے۔ تاہم انسان اکثر اس رشتہ کو دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ انسان کی تمام گمراہیاں دراصل اسی عدم دریافت کا دوسرا نام ہیں۔

شرک کیا ہے۔ شرک یہ ہے کہ کائناتی مظاہر کو خدا کا مختلف روپ فرض کر لیا جائے اور یہ یقین کر لیا جائے کہ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ان کو پوجتا رہے۔ انسان اور کائنات دونوں خدا کی مخلوق ہیں مگر شرک یہ کرتا ہے کہ انسان کو عابد کے مقام پر رکھ دیتا ہے اور کائنات کو معبود کے مقام پر۔

مارکس کی غلطی بھی ایک اعتبار سے اسی نوعیت کی ہے۔ مارکس نے یہ فرض کیا کہ انسان اور بقیہ کائنات دونوں ایک ہی مجموعہ کے مختلف اجزاء ہیں۔ جس طرح مٹی اور پانی دونوں ایک ہی قانون طبیعی کے تابع ہیں، اسی طرح انسان اور کائنات بھی ایک ہی قانون مادی کے تابع ہیں۔ جو قانون مادی دنیا میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ وہی قانون انسانی سماج میں بھی تغیر پیدا کرتا ہے۔

یہ مارکسی فکر کی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے اس کا پورا نظام فکر غلط ہو کر رہ گیا۔ اس نے انسان کو محض مادی روپ میں دیکھا اور انسان اور کائنات کے درمیان ویسا ہی تعلق قائم کیا جیسا تعلق مٹی کے قوانین اور پانی کے قوانین کے درمیان ہوتا ہے۔ مارکس نے انسان کو کائناتی قوانین کا بے اختیارانہ معمول سمجھ لیا۔ حالانکہ کائنات انسان کے اختیارانہ عمل کا ماڈل ہے نہ کہ انسان کی بے اختیاری کی توسیع۔

کارل مارکس کی زندگی کے دو دور ہیں۔ پہلے دور کے مارکس کو انسانیت دوست مارکس (Humanist Marx) کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دور کے مارکس کو اس کے اپنے الفاظ میں سائنٹفک مارکس (Scientific Marx)۔

مارکس جرمنی میں اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہاں صنعتی انقلاب آچکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو لوٹ رہا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنی حرص اور جارحیت کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ وہ ان لوگوں کا حامی بن گیا جو اس زمانہ کے جرمنی اور فرانس اور برطانیہ میں سوشلزم کے اصول پر بہتر سماج کی تعمیر کی باتیں کرتے تھے۔

تاہم جلد ہی مارکس کو یہ احساس ہوا کہ سوشلسٹوں کے پاس اخلاقی اپیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور محض اخلاقی اپیل کے ذریعہ بہتر سماج کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اپنے بعد کے دور میں اس نے اس قسم کے سوشلزم کو خیالی سوشلزم (Utopian Socialism) کا نام دیا۔ اس کے بجائے وہ سائنٹفک سوشلزم کا حامی بن گیا جس کو اب عام طور پر کمیونزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خیالی سوشلزم کے علم بر داروں کا کہنا تھا کہ بنیادی معاشی سرگرمیاں حکومت کے قبضہ یا کنٹرول میں رہنی چاہئیں تاکہ وہ عمومی انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی تنظیم کرے۔ مگر مارکس نے کہا کہ اصل مسئلہ حکومت کے کنٹرول یا نگرانی کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ "سرمایہ دارانہ سماج" میں تمام انسان اپنی غرض اور ذاتی مفاد کے تحت جیتے ہیں۔ جب تک لوگوں کے اندر ذاتی مفاد کا ذہن ختم نہ ہو، بہتر انسانی سماج کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

مارکس نے اپنے طویل مطالعہ کے بعد یہ "دریافت" کیا کہ انسان کا مزاج اور اس کی عادتیں تقسیم اور تبادلہ کے اس نظام کے مطابق بنتی ہیں جو کسی سماج میں رائج ہو۔ مفاد پرستی کا موجودہ مزاج اس لئے ہے کہ سماج کے اندر تقسیم اور تبادلہ کا سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ اگر اس کو بدل کر سماج میں تقسیم اور تبادلہ کا اشتراکی نظام رائج کر دیا جائے تو انسانوں کا مزاج بھی بدل جائے گا۔

اس اعتبار سے مارکس نے انسانی سماج کے تین دور قرار دئے۔

مارکس کے نزدیک انسانی سماج ایک ترقی پذیر حقیقت ہے۔ وہ خود اپنے اندرونی قانون کے تحت ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس سفر کے مطابق انسانی سماج کے تین درجے ہیں۔

سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist society)

سوشلسٹ سماج (Socialist society)

کمیونسٹ سماج (Communist society)

مارکس کے نزدیک یہ تینوں قسم کے سماج معاشی اسباب کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔

انسانی سماج کو قائم رکھنے کے لئے بہت سی مادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ چیزیں سماج کے تمام لوگ مل جل کر تیار کرتے ہیں۔ کوئی شخص ایک کام کرتا ہے اور کوئی دوسرا کام۔ مگر کسی آدمی کی ضرورت صرف وہی ایک چیز نہیں ہوتی جو اس نے خود بنائی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے لئے اس کے سوا بہت سی دوسری چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہر آدمی اپنی پیداوار کا ایک

حصہ دوسرے کو دے کر اس سے وہ چیز حاصل کرے جس کو وہ خود نہیں بنا سکا تھا۔ اس طرح سماج کے مختلف افراد میں باہمی لین دین وجود میں آتا ہے۔ اور اسی لین دین سے وہ اجتماعی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کو سماج کہا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک سماج اس کے سوا کسی چیز کا نام نہیں کہ وہ باہمی لین دین کی اجتماعی تشکیل ہے۔

مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق، کسی سماج کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ ترقی کے کس مرتبہ پر ہے، یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں لین دین کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک اس لین دین کی تین صورتیں ہیں:

قدر تبادلہ (Exchange value)

قدر اصل (Intrinsic value)

قدر استعمال (Use value)

قدر تبادلہ کسی چیز کی وہ قیمت ہے جو سپلائی اور مانگ کے دو طرفہ تقاضوں سے متعین ہوتی ہے چونکہ مختلف اسباب سے کبھی بازار میں چیز زیادہ ہوتی ہے اور مانگ کم اور کبھی چیز کم ہوتی ہے اور مانگ زیادہ۔ اس بنا پر قدر تبادلہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ ایک ہی چیز کبھی کم قیمت پر ملتی ہے اور کبھی زیادہ قیمت پر۔ جس سماج میں چیزوں کا لین دین قدر تبادلہ کے اعتبار سے ہو وہ مارکس کی نظر میں سرمایہ دارانہ سماج ہے۔

قدر اصل کسی چیز کی وہ واقعی قیمت ہے جو انسانی محنت کی بنا پر اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ مارکس کے تجزیہ کے مطابق چوں کہ کسی چیز کا خام مادہ ہمیشہ یکساں قیمت کا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ انسانی محنت بھی یکساں ہوتی ہے جو خام مادہ کو نئی ہوئی چیز میں ڈھالنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہر چیز اپنی قدر اصل کے اعتبار سے ایک ہی قیمت رکھتی ہے۔ باعتبار حقیقت، اس میں نہ کمی کا امکان ہے نہ زیادتی کا۔ جس سماج کا نظام تبادلہ قدر اصل کی بنیاد پر قائم ہو اس کو مارکس سوشلسٹ سماج کہتا ہے۔

قدر استعمال کسی چیز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مارکس کے نزدیک ارتقا یافتہ انسانی سماج ایسا ہی ہوگا۔ یہی وہ سماج ہے جس کو مارکس کمیونسٹ سماج کہتا ہے۔

اگر کسی سماج میں جنس کی صرف قدر استعمال دیکھی جانے لگے تو وہاں جنس کی قدر تبادلہ اور قدر اصل دونوں ختم ہو چکے ہوں گے۔ ایسے سماج میں افراد چیزوں کو اپنی استعمالی قیمت کے اعتبار سے دیکھیں گے نہ کہ ان کی اصلی قیمت یا تبادلی قیمت کے اعتبار سے۔ ایسے سماج میں انسان عین اس طرح چیزوں کا تبادلہ

کریں گے جس طرح دو چھوٹے بچے آپس میں چیزوں کو بدل لیتے ہیں۔ مثلاً ایک بچے کے پاس ضرورت سے زائد ایک نارنگی ہے اور دوسرے کے پاس ضرورت سے زائد گاڑی۔ نارنگی والا بچہ گاڑی چاہتا ہے اور گاڑی والا بچہ نارنگی۔ چنانچہ یہ دونوں بچے بے نیازانہ طور پر آپس میں تبادلہ کرلیں گے۔ اس مثال میں دونوں بچوں کے سامنے نارنگی اور گاڑی کی صرف قدر استعمال ہے۔ اگر یہ بچے قدر اصل اور قدر تبادلہ کو دیکھتے تو معاملہ مختلف ہوتا۔ پھر یہ ہوتا کہ جس بچے کے پاس گاڑی تھی وہ یہ مطالبہ کرتا کہ چار درجن نارنگیاں لاؤ تب میں تم کو گاڑی دوں گا۔ جس سماج میں جنس کو صرف قدر استعمال کے اعتبار سے دیکھا جائے اس سماج میں اشیار کا تبادلہ اس طرح ہوگا جیساکہ مذکورہ بچوں نے کرلیا۔ مارکس کے نزدیک ان بچوں اور کمیونسٹ سماج کے تبادلۂ اجناس میں صرف یہ فرق ہے کہ بچوں نے یہ تبادلہ غیر شعوری طور پر کیا جب کہ کمیونسٹ سماج میں ایک خاص اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی ماحول میں یہ تبادلہ شعوری طور پر ہوگا۔

سماج کی ان تینوں قسموں کی تشریح دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ جس سماج میں چیزوں کا لین دین نفع کی غرض سے ہو وہ سرمایہ دارانہ سماج ہے۔ جس سماج میں کوئی شخص کسی سے نفع کا طالب نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی محنت کے بقدر پورا معاوضہ ملے وہ سوشلسٹ سماج ہے۔ اور جہاں آدمی ان دونوں چیزوں سے بلند ہو جائے، جہاں نہ تو ایسا ہو کہ آدمی ایک دوسرے سے نفع حاصل کرنا چاہے، نہ یہی ضروری ہو کہ کوئی شخص جتنا کرے اتنا ہی وہ اپنے لئے پائے۔ بلکہ ہر شخص کو کسی رکاوٹ کے بغیر اس کی ضرورت کی چیزیں حسب خواہش اس طرح ملتی رہیں جیسے آج ہوا اور پانی مل رہے ہیں۔ یہی آخری سماج کمیونسٹ سماج ہے جو مارکس کے تجزیہ کے مطابق انسانی سماج کے ارتقار کی بلند ترین منزل ہے۔ یہ ایسا سماجی نظام ہے جس میں چیزوں کی صرف قدر استعمال دیکھی جائے گی اور اسی نقطۂ نظر سے افراد مختلف جنسوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے۔ ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لیتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس نے کتنی محنت خرچ کی ہے اور اس کو اپنی محنت کا کتنا معاوضہ مل رہا ہے۔ تمام تبادلے صرف استعمالی ضرورت کے پیش نظر ہوں گے نہ کہ نفع طلبی یا معاوضۂ خدمت کے طور پر۔

ابنزر الیٹ (Ebenezer Elliot) نے کمیونسٹ کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی ——— کمیونسٹ کون ہے۔ کمیونسٹ وہ ہے جو غیر مساوی کمائی کی مساوی تقسیم چاہتا ہے:

What is a communist ? One who hath yearnings
For equal division of unequal earnings.

روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں پیش آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے روس میں کمیونسٹ سماج کی

تعمیر پر اب جلد ہی ستر سال پورے ہو جائیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی نے روس کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں ذاتی ملکیت کے تمام اداروں کو افراد کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اور وہ کوشش شروع کر دی جس کو اسٹالن نے سوویت انسان (Soviet Man) کی تعمیر کا نام دیا تھا۔ مگر ایک منظم اور ہمہ گیر ریاست کی طویل کوشش کے باوجود ابھی تک سوویت انسان وجود میں نہیں آیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ روس کے کمیونسٹ لیڈروں کو روس میں آزادانہ انتخاب کرانے کی ہمت نہیں۔ کیوں کہ انھیں یقین ہے اگر انھوں نے آزادانہ انتخاب کرایا تو روسی عوام ۹۹ فی صد ووٹ ان کے خلاف دے کر ان کے اقتدار کا تختہ الٹ دیں گے۔

روس کے کمیونسٹ لیڈروں نے قدر تبادلہ (Exchange value) پر مبنی معاشی نظام کو بے رحمی کے ساتھ توڑ دیا اور طاقت کے زور پر یہ کوشش شروع کر دی کہ قدر اصل (Intrinsic value) کی بنیاد پر سماج کی تشکیل ہو سکے۔ اور اس کے بعد قدر استعمال (Use value) کی بنیاد پر تشکیل پانے والے سماج کی طرف سفر شروع ہو۔ مگر ناقابل بیان مظالم کے باوجود پہلا مرحلہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اور دوسرے مرحلہ کے سماج کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

جن چیزوں کو مارکس نے "سرمایہ دارانہ سماج" کا نتیجہ قرار دیا تھا وہ سب آج اشتراکی روس کے اندر موجود ہیں۔ روسی حکومت مسلسل ایسے شہریوں کا اعلان کرتی رہتی ہے جو کام چوری، غبن، جاسوسی، غداری اور رجعت پسندی جیسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر اشتراکی سماج میں مارکس کے مزعومہ نتائج نکلتے ہوں تو اشتراکی سماج میں ستر سال بعد بھی لوگوں کا یہ حال کیوں ہے۔

ایک کتاب میں راقم الحروف نے ایک قصہ پڑھا جو مندرجہ ذیل الفاظ میں درج تھا۔

A communist deputy approached a conservative member of the French Senate and showed to him a special edition of the works of Karl Marx, printed in Braille. "These are for the blind." He explained. "Monsieur," replied the Senator, "All the works of Marx are for the blind."

ایک اشتراکی ڈپٹی فرانس کی پارلیمنٹ کے ایک قدامت پسند ممبر سے ملا اور اس کو کارل مارکس کی تحریروں کا ایک خصوصی اڈیشن دکھایا جو بریل طریقہ پر چھپا ہوا تھا۔ اشتراکی نے کہا کہ یہ اڈیشن اندھوں کے لئے ہے۔ فرانسیسی نے جواب دیا۔ جناب، مارکس کی تمام تحریریں اندھوں ہی کے لئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مارکس کے نظریہ پر وہی ایمان لا سکتا ہے جو اندھے پن کی وجہ سے حق اور ناحق کو نہ جانے۔ آنکھ والا آدمی تو اس کی لغویت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مارکس نے اپنے نقطۂ نظر کو سائنس کے نام پر پیش کیا تھا۔ مگر یہ خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسزم محض ایک خیالی فلسفہ تھا جو علم اور منطق کی میزان پر ایک دن بھی پورا نہ اتر سکا۔
چنانچہ مارکس کے جلد ہی بعد مارکس کے فلسفہ میں نظر ثانی (Rivisionism) کی تحریک چل پڑی جو مسلسل جاری رہی۔ نظر ثانی کی تحریک اصل مارکسزم میں اتنی تبدیلی پیدا کر چکی ہے کہ سڈنی ہک (Sidney Hook) نے بجا طور پر جدید مارکسزم کو مارکس کی آمد ثانی (Marx's Second Coming) کا نام دیا ہے۔ اپنی غیر عملیت کی وجہ سے ایک مبصر کے الفاظ میں کارل مارکس اب پرولتاریوں (Proletariat) کا نہیں بلکہ پروفیسروں (Professoriat) کا چیمپین بن چکا ہے۔ (*TOI*, 15-1-1984)
الوجین کینِنکا (Eugene Keninka) نے شبہہ ظاہر کیا ہے کہ ایک متعین اصول جس کو مارکسزم کہا جاسکے کہیں موجود ہے:

If there is a coherent doctrine called Marxism.

کمیونزم آج اپنے نظریہ کی بنیاد پر کہیں موجود نہیں وہ صرف اس لئے موجود ہے کہ اس کے نام پر ایک طاقتور ریاست قائم ہے اور بہت سے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔ اب لوگ نظری صداقت کی بنا پر نہیں بلکہ جبر یا مفاد کی بنا پر کمیونسٹ بنے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مبصر نے کہا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ آدمی کمیونسٹ ہو حالانکہ وہ مارکسسٹ نہ ہو:

It is possible to be a communist without being a Marxist.

کمیونسٹ ملکوں میں چوں کہ اظہار خیال کی آزادی نہیں ہے۔ اس لئے وہاں کے عوام اپنے احساسات کو لطیفوں کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ ہندستان کا ایک شخص مشرقی (کمیونسٹ) یورپ کے دورہ پر گیا۔ واپس آکر اس نے اپنے سفر کے جو تاثرات بیان کئے ان میں سے ایک قصہ یہ بھی تھا جس کو اس نے وہاں کی نجی ملاقاتوں میں سنا:

> One morning a school girl came to her teacher and said very proudly: "Our cat has had a litter of six kittens and they are all Communists." The teacher was impressed with the child and invited the Inspector to visit the school and see for himself how well-doctrinated her students were. A week later the inspector arrived. "Tell the gentleman about your cats," the teacher asked her student "She has had six kittens and they are all democrats," said the girl. "What !" exclaimed the teacher aghast and let down, say now they are democrats ?" "Since then their eyes have opened," replied the student.

ایک صبح کو ایک اسکول کی لڑکی اپنی ٹیچر کے پاس آئی۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ ہماری بلی نے چھ

بچے دیے ہیں۔ اور وہ سب کے سب کمیونسٹ ہیں۔ ٹیچر لڑکی کی بات سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے انسپکٹر کو دعوت دی کہ وہ آئے اور خود دیکھے کہ اس کے طلبہ کس قدر تربیت یافتہ ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد انسپکٹر آیا۔ ٹیچر نے لڑکی کو بلایا اور کہا کہ ان صاحب سے اپنی بلی کے بارہ میں بتاؤ۔ لڑکی نے کہا کہ ہماری بلی نے چھ بچے دئے تھے اور وہ سب کے سب جمہوریت پسند ہیں۔ ٹیچر کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے ہفتہ تم نے بتایا تھا کہ وہ سب کے سب کمیونسٹ ہیں۔ اب تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ سب کے سب جمہوریت پسند ہیں۔ لڑکی نے جواب دیا کہ اتنے دنوں میں ان بچوں کی آنکھیں کھل گئی (ہندستان ٹائمس ۱۴ جنوری ۱۹۸۴)

یہ صورت جو مارکس کے ساتھ پیش آئی یہی موجودہ زمانہ میں بعض مسلم مفکرین کے معاملہ میں بھی پیش آئی ہے۔ ان مسلم مفکرین نے اپنی انتہا پسندانہ خوش خیالی کے تحت اسلام کی ایک تعبیر پیش کی۔ یہ تعبیر وقتی طور پر بہت سے لوگوں کو پسند آئی۔ وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ پچھلے چالیس پچاس سال کے نتیجہ میں اب ان مفکرین کے نام پر ایک حلقہ بن گیا اور اس کا ایک ڈھانچہ (Establishment) قائم ہو گیا۔ اس کی وجہ سے اب اس فکری حلقہ سے وابستگی میں قیادت اور اقتصادی مفاد کی کشش پیدا ہو گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مفکرین کے وابستگان اپنے قائد کے نظریہ کو مانے بغیر اس کے حلقہ سے وابستہ ہیں۔ وہ "مارکسی" نہ ہوتے ہوئے بھی "کمیونسٹ" بنے ہوئے ہیں۔

جو کھوئے وہی پاتا ہے

خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت خالد کو ایک جہاد پر روانہ کیا۔ اس وقت آپ نے ان کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ موت کے حریص بنو تم کو زندگی دی جائے گی (احرص علی الموت توھب لك الحیاۃ)

صرف معلومات سے کوئی شخص عالم نہیں بنتا

حضرت مالک بن انس کا قول ہے کہ علم ایک روشنی ہے جو صرف ایسے دل سے مانوس ہوتا ہے جو ڈرنے والا اور فروتنی کرنے والا ہو (العلم نور لا یأنس الّا بقلب تقی خاشع)

خوش حالی زیادہ سخت آزمائش ہے

ابویعلی اور بزار نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لأنا لِفتنة السراء اخوف علیکم من فتنة الضراء۔ انکم ابتلیتم بفتنة الضراء فصبرتم وان الدنیا حلوة خضرة	میں تمھارے بارہ میں خوشحالی کے فتنہ سے زیادہ ڈرتا ہوں بہ نسبت تنگ حالی کے فتنہ کے۔ تم تنگ دستی کے فتنہ میں مبتلا کئے گئے اور تم نے صبر کیا۔ مگر دنیا بڑی شیریں اور سرسبز ہے۔

طبرانی نے عوف بن مالک کے واسطہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

تصب علیکم الدنیا صبا حتی لا یزیغکم بعد ان زغتم الا ھی	دنیا تمھارے اوپر بہہ پڑے گی یہاں تک کہ میرے بعد تمھارے اندر کجی آئی تو دنیا کے سوا کسی اور سبب سے نہیں آئے گی۔

گھمنڈ خدا کے یہاں قابل معافی نہیں

عن سفیان الثوری: کل معصیة عن شھوة فانه یُرجی غفرانھا وکل معصیة عن الکبر فانه لا یرجی غفرانھا۔ لان معصیة ابلیس کان اصلھا من الکبر وزلة آدم کان اصلھا من الشھوة	حضرت سفیان ثوری نے کہا کہ ہر گناہ جو خواہش سے ہوتا ہے اس کی معافی کی امید ہے اور ہر گناہ جو بڑائی سے ہوتا ہے اس کی معافی کی امید نہیں کیوں کہ ابلیس کا گناہ بڑائی کے سبب سے تھا اور آدم کی لغزش خواہش کے سبب سے۔

آدم کو توبہ کے بعد معافی مل گئی۔ ابلیس ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کر دیا گیا۔

الزام تراشی کی کوئی حد نہیں

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں جو اموال غنیمت حاصل ہوئے تھے جب ان کی تقسیم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اشراف عرب کو باقی لوگوں پر ترجیح دی اور ان کو نسبتاً زیادہ دیا۔ ایک مسلمان نے یہ دیکھ کر کہا کہ خدا کی قسم، یہ ایک ایسی تقسیم ہے جس میں نہ عدل کیا گیا ہے اور نہ اس میں اللہ کی رضا چاہی گئی ہے (واللہ ھذہ قسمۃ ما عدل فیھا، وما أرید فیھا وجہ اللہ)

نصیحت کرنے کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے

حضرت خریم ایک صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ان کے بارہ میں فرمایا: خریم اسدی کیا ہی اچھے آدمی ہیں۔ کاش ان کے بالوں کی لٹ لمبی نہ ہوتی اور ان کی تہمد نیچے نہ لٹکتی (نعم الرجل خریم الاسدی لولا طول جمتہ واسبال ازارہ، سنن ابی داؤد) حضرت خریم کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے ایسا کہا ہے تو انھوں نے ایک چھری لی اور اپنے بال کی لٹوں کو کاٹ دیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت عبد اللہ کے بارے میں ایک بار فرمایا کہ عبد اللہ کیسے اچھے آدمی ہیں۔ کاش وہ رات کو نماز پڑھتے (نعم الرجل عبد اللہ لو کان یصلی باللیل، بخاری) حضرت عبد اللہ کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے ایسا کہا ہے تو انھوں نے فوراً اس پر عمل شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ راتوں کو بہت کم سوتے تھے۔

جس کی شرارت کا اثر اس کے بعد بھی باقی رہے

ایک حکیم کا قول ہے کہ برکت اس کے لئے ہے کہ جب وہ مرا تو اسی کے ساتھ اس کے گناہ بھی مر گئے۔ اور ہلاکت اس کے لئے ہے کہ جب وہ مرے تو اس کے بعد اس کے گناہ باقی رہیں (طوبیٰ لمن اذا مات ماتت معہ ذنوبہ وویل لمن یموت وذنوبہ باقیۃ بعدہ)

بول چال بند کرنا جائز نہیں

عن عطاء بن یزید اللیثی ثم الجندعی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یحل لاحد ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال۔ یلتقیان فیصد ھذا ویصد ھذا۔ وخیرھما الذی یبدأ بالسلام۔ (اخرجہ البخاری)

رسول اللہ نے فرمایا۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے رکھے دونوں ایک دوسرے سے ملیں مگر وہ اس سے اعراض کرے اور یہ اس سے اعراض کرے۔ اور ان دونوں میں

فی کتاب الادب)　　　　　　　　　سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

جب ہر چیز آخرت کی یاد کا ذریعہ بن جائے

ابن کثیر نے سورہ توبہ کی تفسیر کے آخر میں ایک حدیث نقل کی ہے جو حسب ذیل ہے:

قال الطبرانی حدثنا محمد بن عبد الله الحضرمی حدثنا محمد بن عبد الله بن یزید المقری حدثنا سفیان بن عیینہ عن قطن عن ابی الطفیل عن ابی ذر قال: ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکرلنا منہ علماً۔

طبرانی نے روایت کی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور حال یہ تھا کہ اگر کوئی چڑیا اپنے دونوں پروں کو فضا میں ہلاتی تو اس سے بھی آپ ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کرتے تھے۔

اصلاح صرف قرن اول کی تقلید سے

امام مالک نے فرمایا کہ امت مسلمہ کا آخر بھی صرف اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہوا تھا۔

(لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اوّلھا)

عمل کی قیمت ملتی ہے نہ کہ محض آرزوؤں کی

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بار فرمایا۔ اے اللہ کے بندو، میں تم کو اور اپنے کو تقویٰ اور اطاعت کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور عمل اپنے آگے بھیجنے کی اور بے بنیاد آرزؤں کو چھوڑنے کی۔ کیوں کہ جو شخص عمل میں کم رہ جائے اس کو آرزوئیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں (اوصیکم عباد اللہ ونفسی بتقوی اللہ ولزوم طاعتہ۔ وتقدیم العمل وترک الامل فانہ من فرط فی عملہ لم ینتفع بشئی من املہ)

دشمن سے بھی نفرت نہ کیجئے

احد کی جنگ میں دشمنوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے۔ پتھر آپ کو لگے۔ آپ کے دانت ٹوٹ گئے اور آپ کے چہرہ سے خون بہنے لگا۔ اس جنگ میں آپ کے چچا حضرت حمزہ مارے گئے اور بہت سے صحابہ قتل ہوئے۔ چنانچہ آپ کے کچھ اصحاب نے آپ سے کہا کہ ان دشمنوں کے خلاف بد دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ داعی اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (انی لم ابعث لعانا ولکن بعثت داعیا ورحمۃ)

پیغمبر اسلام

قرآن میں ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل (آل عمران ۱۴۴)
اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام محمد صلے اللہ علیہ وسلم ویسے ہی ایک رسول تھے جیسے دوسرے تمام رسول۔
آپ میں اور دوسرے رسولوں میں درجہ اور منصب کا کوئی فرق نہیں۔ خدا کے تمام رسول ایک ہی دین
لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا۔ اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں
کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔

اس سلسلے میں یہاں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں :

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا تخیرونی بین الانبیاء (متفق علیہ)	مجھ کو نبیوں کے درمیان ممتاز نہ ٹھہراؤ۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (بخاری)	اللہ کے نبیوں میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما ینبغی لاحد ان یقول انی خیر من یونس بن متی (متفق علیہ)	کسی شخص کو نہیں چاہئے کہ وہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال انا خیر من یونس بن متی فقد کذب (بخاری)	جس شخص نے کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے جھوٹ کہا۔

پھر محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رسولوں میں کیا فرق تھا۔ وہ فرق یہ تھا کہ دوسرے رسول صرف
رسول تھے اور آپ اس کے ساتھ آخری رسول (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین) دوسرے
رسول سلسلۂ رسالت کی درمیانی کڑی تھے اور آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی۔
ایک شخص جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ آپ کے یہاں

کچھ ایسی چیزیں پاتا ہے جو دوسرے انبیاء کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ اب چوں کہ قرآن آپ کی اضافی حیثیت صرف یہ قرار دیتا ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ مانیں کہ یہ مزید چیزیں خاتم النبین ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان مزید چیزوں کی توجیہ ختم نبوت کے تصور کے تحت کی جائے گی نہ کہ کسی اور تصور کے تحت۔ جو چیزیں آپ میں اور دوسرے رسولوں میں مشترک ہیں وہ آپ کی حیثیت رسالت کے خانہ میں جائیں گی۔ اور جو چیزیں آپ میں اور دوسرے نبیوں میں مشترک نہیں وہ آپ کی حیثیت خاتم النبیین کے خانہ میں۔

مثلاً محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کے مخالفین پر سیاسی فتوحات حاصل ہوئیں۔ آپ کا دین زمین کے ایک بڑے حصہ میں غالب اور حکمراں ہوگیا۔ یہ ایسی چیز جو دوسرے نبیوں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ یہ فرق کیوں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کا لایا ہوا دین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ (اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُون) کوئی طاقت اس میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہ کر سکے۔ آسمانی کتاب میں تحریف کے بعد نیا نبی آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چوں کہ آپ کے بعد خدائی اسکیم میں کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی مستقل اور قابل اعتماد حفاظت کا انتظام کر دیا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جو سیاسی غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔

یہ خدا کی ایک خاص مصلحت تھی جس کے لئے آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو عرب میں اور اطراف عرب میں کامل غلبہ دیا گیا۔ اس طرح خدا کی آخری کتاب کی پشت پر ایک ایسی طاقت و رحکومت کھڑی کر دی گئی جو صدیوں تک مسلسل اس کی حفاظت کرتی رہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام دشمن طاقتیں قرآن کو مٹا ڈالتیں یا اس کو اس طرح بدل دیتیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیاسی غلبہ کو جمع کرنا آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کے لئے تھا۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ سیاسی غلبہ کے ذریعہ یہ مقصد صد فی صد حاصل ہوا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر قرآن و حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ اور آپ کی صحیح اور سچی تصویر یقینی طور پر وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔

ایک سفر

۸ ستمبر ۱۹۸۳ کو جب انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۳ مجھ کو لئے ہوئے تقریباً نو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دہلی سے بنگلور جا رہی تھی تو اچانک مجھ کو خیال آیا کہ خدا انسانی سفر کو تیز رفتار بنا کر خاموش زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ میرا پیغام لے کر دوڑو اور اس کو تمام لوگوں تک پہنچا دو، قبل اس کے کہ میرے کسی بندے پر موت آئے اور وہ بے خبری کی حالت میں اپنے انجام کو پہنچ جائے ——— آدمی موت سے کتنا قریب ہے، مگر وہ اِس واقفیت سے کتنا دور ہے جس کے بغیر کامیابی کے ساتھ موت کا استقبال نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارا جہاز جب ہوائی اڈہ کی سڑک (رن وے) پر دوڑ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ یہ جہاز اگر اسی طرح اپنا پر پھیلائے ہوئے زمین پر دوڑتا رہے اور رن وے سے اوپر اٹھ کر پرواز نہ کرے تو کل کے اخبار کے لئے صفحہ اوّل کی ایک خبر بن جائے گی، جہاز اور اس کے مسافروں کی ہلاکت کی خبر۔ مگر جہاز نے جب ایسا کیا کہ وہ رن وے کی حد آنے سے پہلے فضا میں اڑ گیا اور تمام مسافروں کو لئے ہوئے خیریت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ گیا تو اس کی کوئی خبر اخبار میں نہیں چھپی۔

ایسا کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اخبار والوں کو جہاز کی بربادی سے اتنی زیادہ دل چسپی ہے۔ مگر جہاز کی آبادی اور کامیابی سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ اس سوال کا جواب میری سمجھ میں اس وقت آیا جب کہ میں نے اس کی برعکس صورت پر غور کیا۔

میں نے اپنے جی میں کہا کہ فرض کرو کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہو۔ یعنی ہر جہاز جو ہوائی اڈہ سے روانہ ہو وہ فضا میں اڑنے سے پہلے برباد ہو جایا کرے۔ اس کے بعد استثنائی طور پر یہ واقعہ ہو کہ ایک جہاز اپنے مقام سے اڑے اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے تو اس کی خبر تمام اخبارات میں خصوصی اہتمام کے ساتھ چھاپی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ نہ جہاز کی بربادی کا ہے اور نہ اس کی آبادی کا۔ اصل مسئلہ نئے پن کا ہے۔ لوگ ہمیشہ کوئی نئی چیز چاہتے ہیں۔ یہی نئی چیز چاہنے کا جذبہ ہے جس کی بنا پر آج اخبار والے تباہ شدہ جہاز کی خبر فوراً چھاپتے ہیں جو کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اور منزل پر پہنچنے کی خبر نہیں چھاپتے کیوں کہ وہ روزانہ برابر ہو رہا ہے۔ اور اب اس میں کوئی نیا پن نہیں ——— اکثر سوالات کا جواب اس وقت سمجھ میں آجاتا ہے جب کہ اس کی برعکس صورت پر غور کیا جائے۔

۹ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ فریزر ٹاؤن کی جامع مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے ایک تقریر ہوئی۔ وسیع مسجد تقریباً پوری بھری ہوئی تھی۔ میں نے سورہ جمعہ کے آخری رکوع کی روشنی میں ۳۰ منٹ کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ان آیات میں مسجد کے فعل کو بھی "ذکر" کہا گیا ہے اور مسجد کے باہر جو فعل مطلوب ہے اس کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جمع کرکے ہم سے جو عمل کرایا جاتا ہے اسی کو ہمیں مسجد کے باہر بھی دہرانا ہے۔ پھر میں نے بتایا کہ زندگی کا راز ہے اہم کی خاطر غیر اہم کو چھوڑنا، اور یہی وہ سبق ہے جو جمعہ کی نماز کے ذریعہ ہمیں دیا جاتا ہے۔

بنگلور سے روزنامہ دکن ہرالڈ نکلتا ہے۔ یہ کرناٹک کا سب سے بڑا انگریزی اخبار ہے۔ اس اخبار کے دو رپورٹر انٹرویو لینے کے لیے آئے۔ ۲½ بجے سے ۴ بجے تک ان سے ملاقات رہی۔ انھوں نے ہمارے مشن (اسلامی مرکز) کی تفصیلات دریافت کیں۔ مشن کے مقصد کے سلسلے میں میں نے بتایا کہ ہمارا مقصد ہے ـــــ لوگوں کے اندر جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی پیدا کرنا۔ اس مقصد کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت کی اور اس ضمن میں ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ دکن ہرالڈ (۱۸ ستمبر ۱۹۸۲) میں جو رپورٹ چھپی تھی اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

VOICE OF REASON

In these times of religious fanaticism tearing at the fabric of national life, sane voices teaching tolerance - even respect for the other faith - are hard to come by. It was a pleasure, therefore, to meet the other day, Maulana Wahiduddin Khan, who is on a mission to "promote love between man and man."

In scholarly circles, Maulana Wahiduddin Khan, founder of the Islamic Centre in Delhi, is considered among the greatest contemporary Muslim thinkers anywhere. The 58-year-old Maulana has devoted his life to spreading the message of Islam in its true spirit. Unfortunately, he says, practising one's religion has come to mean for many the hatred of others. "Unless moulders of public opinion try to banish such mistaken notions implanted in people's minds our future will be bleak." The erudite Urdu scholar has over 33 books to his credit. His magnum opus, *Al-Islam Yatahadda*, is prescribed study at the renowned Al-Azhar University of Cairo, and other universities in the Gulf. Reviewing the book, *Al-Ahram*, the Cairo daily, said : "It is one of the greatest books ever written in the whole history of Islam." The Maulana plans to bring out an Islamic encyclopaedia shortly.

A crusader for communal peace in the country, he declares that fanaticism should be fought tooth and nail in order to foster communal harmony.

Widely travelled, the Maulana edits *Al-Risala*, a monthly Urdu magazine devoted to serious study of Islam and contemporary issues. Its English version is due next month.

For all his learning, Maulana Wahiduddin Khan is a very unassuming man. He doesn't talk of achievements, but only goals. And he believes that alone his voice would be drowned in the cacophony of the fanatics. More and more should share in building bridges between man and man, he appeals. Any takers?

شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان گلستان ہال میں خطاب ہوا۔ ہال پورا بھرا ہوا تھا میں نے ایک گھنٹہ کی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اللہ کا ڈر دلوں میں آجانا، یہی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ہے انتم الاعلون ان کنتم مومنین (تم ہی غالب ہوگے اگر تم مومن ہو) اس آیت میں مومن سے مراد اگر "کلمہ گو" ہو تو آج کلمہ گو مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں تقریباً ایک ارب ہے۔ مگر مسلمان آج سب سے زیادہ مغلوب حالت میں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن سے مراد کلمہ گو نہیں۔ مومن سے مراد وہ انسان ہے جس کو خدا کی یافت ہو جائے اور خدا جیسی عظیم ہستی کی یافت آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کا نام تقویٰ اور خوف ہے۔ مسلمانوں کے اندر سے خوف خدا رخصت ہو گیا ہے۔ یہی ان کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔ مختلف تاریخی مثالوں کے ذریعہ میں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

۱۰ دسمبر کو ۱۱ بجے ڈاکٹر حیات اسماعیل صاحب کے مکان (بنسن روڈ) پر ایک نشست ہوئی جس میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی موجود تھیں۔ اس موقع پر میں نے "ایمان بالغیب" کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ ایمان بالغیب کا لفظ کثرت استعمال سے ہمارے لئے کچھ رسمی سا ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم اس کی پوری معنویت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں اگر لفظ کو بدل دیا جائے تو بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایمان بالغیب کا مطلب وہی ہے جس کو آجکل کی زبان میں ڈسکوری (دریافت) کہا جاتا ہے۔ میں نے تاریخ کی مثالوں سے بتایا کہ ڈسکوری کس طرح آدمی کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ہم ایمان کو لوگوں کے لئے ڈسکوری بنا دیں تو اچانک ہم دیکھیں گے کہ نئی شخصیت والے انسان پیدا ہو گئے ہیں۔ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔

رات کو ۹ بجے بنگلور سٹی کی جامع مسجد میں خطاب ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر ہوئی میں نے صحابہ کرام اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تقابلی مثالوں سے یہ دکھایا کہ صحابہ نے ایک بڑی چیز پائی تھی اور ہم اس بڑی چیز کو نہ پاسکے۔ وہ خدا کو پائے ہوئے تھے اس لئے ہر دوسری چیز ان کی نظر میں چھوٹی ہو گئی تھی۔ ہم نے خدا کو نہیں پایا ہے اس لئے چھوٹی چیز بھی ہم کو بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ کسی نقصان کو ہم برداشت نہیں کر پاتے۔ حالانکہ زندگی کا راز یہ ہے کہ جو آدمی نقصان کو برداشت کرے وہی نفع کا مالک بنتا ہے۔

۱۱ دسمبر کو صبح ۱۰ بجے ہرشا ہوٹل کے ہال میں تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے دکھایا کہ قرآن ہی اس آسمان کے نیچے خدا کی واحد محفوظ اور مستند کتاب ہے اور وہی تمام انسانوں کی نجات کا ذریعہ

ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں دعوت اسلامی کی اہمیت واضح کی۔

ایک بجے دن میں جناب اعظم جان صاحب کے مکان پر ایک نشست ہوئی۔ اس نشست میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شہر کے معزز افراد جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر میں نے دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس کی اہمیت پر گفتگو کی اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات بیان کئے۔

شام کو مغرب بعد کمرشیل اسٹریٹ پر ایک ہال میں تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے "ختم رسالت" کی اہمیت واضح کی۔ ۲۱ ستمبر کو دن میں ۱۲ بجے الامین کالج کے طلبہ کے سامنے تقریر ہوئی اس تقریر میں میں نے علم کی اہمیت واضح کی اور تاریخ کی مثالوں سے بتایا کہ کس طرح علم قوموں کی زندگی اور مستقبل کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔

بنگلور کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے جس میں تقریباً ۲۰ فی صد مسلمان ہیں۔ اگر یہاں مسلمانوں کی حیثیت کا اندازہ ان مسلمانوں سے لگایا جائے جو اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہتر ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ بنگلور ہندستان کے ان انتہائی چند شہروں میں سے ہے جہاں وہ واقعی معنوں میں خوش حال ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو نہ صرف خلیجی ممالک سے حصہ مل رہا ہے، بلکہ شہر کی تجارتوں میں ان کا تناسب ان کی آبادی سے قابل لحاظ حد تک زیادہ ہے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنی خوش حالی کا صحیح استعمال کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق ایسے لوگ شاذو نادر ہوں گے جو باقاعدہ طور پر اپنی سالانہ زکوٰۃ نکالتے ہوں۔ ایسے لوگ بھی کم ملتے ہیں جنھوں نے اپنی آمدنیوں کو خود اپنی ذات کے اعتبار سے تعمیری مدوں میں خرچ کیا ہو۔

کئی ایسے لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آئے جو مجھ سے سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے واقعی معنوں میں کوئی کارآمد سوال کیا ہو۔ کسی کا سوال فاتحہ اور درگاہ کے بارہ میں تھا۔ کوئی اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ مردہ کو ایصال ثواب کس طرح کرنا چاہئے، وغیرہ۔

تاہم بنگلور میں بڑی تعداد میں ایسے مسلمان ہیں جن کو "تعلیم یافتہ" کہا جا سکتا ہے۔ ان کی قابل لحاظ تعداد سنجیدگی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اور اس کے پیغام کا وزن محسوس کرتی ہے۔ نوجوانوں میں ایک تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو الرسالہ کے مشن کے لئے کام کرنے کی خواہش مند ہے۔ اور اس کے لئے سرگرم ہے۔ یہاں حلقۂ الرسالہ کے ہفتہ وار اجتماع کا نظم بھی قائم ہو گیا ہے۔

میری ہر تقریر کے ساتھ اجتماع گاہ میں کتابوں کا اسٹال رکھا گیا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔ اور مطالعہ کے لئے لے گئے۔

بنگلور سے ۲۵ کلو میٹر کے فاصلہ پر وھائٹ فیلڈ میں ستیہ سائی بابا کا مرکز ہے۔ ۱۰ ستمبر کی سہ پہر کو ہم اسے دیکھنے کے لئے گئے۔ "سائی بابا کا کنگڈم یہاں سے ایک کیلو میٹر کے بعد شروع ہو جائے گا" ڈاکٹر اسماعیل صاحب نے کہا جو گاڑی میں میری بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سڑک کے کنارے ایک بورڈ دکھائی دیا جس پر لکھا ہوا تھا:

Kingdom of Satya Sai Baba

بورڈ دیکھنے سے پہلے میں نے سمجھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کنگڈم (سلطنت) کا لفظ تفریح کے طور پر کہا ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ واقعۃً اس کا نام یہی ہے۔ سائی بابا کا یہ مرکز سڑک کے کنارے تقریباً تین کیلو میٹر لمبے اور دو کیلو میٹر چوڑے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کے فارم، اسکول، کالج، اسپتال، لائبریری، پریس، وغیرہ وغیرہ چیزیں موجود ہیں۔ یہ پوری طرح ایک خود کفیل دنیا ہے۔ جو اپنی ضرورت کی تمام چیزیں (غلہ سے لے کر کتاب تک) خود تیار کرتی ہے۔

اس وقت سائی بابا اپنے مرکز میں موجود نہ تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے کچھ معتقدین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مسٹر وی۔ کے نرسیمن (سابق اڈیٹر انڈین اکسپرس) سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک الکٹرانک گھڑی تھی جس کے متعلق انھوں نے کہا کہ سائی بابا نے اس کو مجھے جنگل کے درمیان دیا تھا:

It was given to me by Swami in the middle of the forest.

میں نے قریب سے دیکھا تو یہ گھڑی ٹھیک ویسی ہی تھی جیسی عام گھڑی ہوتی ہے۔ میں حیران ہوا کہ لوگ کتنے سادہ ہیں کہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ سائی بابا نے یہ گھڑی کسی آسمانی فیکٹری سے پراسرار طور پر حاصل کر کے انھیں دی ہے۔ اگر واقعی یہ گھڑیاں "آسمان" سے آتی ہیں تو ان کا ڈزائن عام زمینی گھڑیوں سے مختلف کیوں نہیں۔

مسٹر نرسیمن نے کہا کہ سائی بابا خدا کے اوتار ہیں۔ اوتار کی تشریح انھوں نے اس طرح کی کہ لکڑی کا چھوٹا پل ٹوٹ جائے تو گاؤں والے خود ہی اس کی مرمت کر لیتے ہیں۔ مگر جب لوہے کا بڑا پل ٹوٹتا ہے تو انجینیر کو خود اس کو درست کرنے کے لئے آنا پڑتا ہے۔

میں نے کہا آج جب کہ انسانی سماج کا انجنیئر خود اصلاح کے لئے زمین پر آگیا ہے تو انسانی سماج کی خرابیوں کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ انھوں نے اب ایک اور مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص بھگوان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ بارش کی وجہ سے میرا گھر گر رہا ہے، بارش کو بند کیجئے۔ اب اگر بھگوان بارش کو بند کر دیں تو کسان آکر فریاد کریں گے کہ ہماری فصل سوکھے کی وجہ سے برباد ہو گئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ پل کے ٹوٹنے میں بھی کوئی مصلحت تھی، اس لئے بھگوان اس کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ جب ایسا ہے تو پھر بھگوان کو زمین پر آنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ کیوں کہ آپ کے کہنے کے مطابق وہ اس وقت زمین پر آتے ہیں جب کہ ٹوٹے ہوئے پل کو درست کرنے کی ضرورت ہو۔

۴ فروری ۱۹۸۴ کو دہلی میں ایک کشمیری نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ماہنامہ الرسالہ شروع سے خریدتے ہیں۔ اور مکتبہ الرسالہ کی مطبوعات بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں الرسالہ کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔

حال میں ایک سفر کے دوران وہ ایک دن کے لئے بنگلور میں ٹھہرے تھے۔ بنگلور میں انھوں نے ایک دکاندار سے الرسالہ کا تذکرہ کیا۔ دکاندار نے جواب دیا کہ ہم اس نام کے کسی رسالہ سے واقف نہیں اور ہم رسالے وغیرہ پڑھتے بھی نہیں۔ یہ سب مولویوں کے جھگڑے ہیں اور مولوی ہم کو بہت برباد کر چکے ہیں۔

مذکورہ کشمیری نوجوان بنگلور سے یہ تاثر لے کر لوٹے کہ بنگلور میں ابھی الرسالہ کی آواز نہیں پہنچی ہے۔ حالاں کہ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے بنگلور کے ایک دکاندار کو بنگلور سمجھ لیا۔ اگر وہ بنگلور کے سفر میں ہمارے ساتھ ہوتے تو ان کا تاثر دوسرا ہوتا۔ کیوں کہ بنگلور میں خدا کے فضل سے الرسالہ کی کئی ایجنسیاں کامیابی سے چل رہی ہیں۔ اور وہاں راقم الحروف کی تقریروں میں بھی کثرت سے تعلیم یافتہ طبقہ شریک ہوا۔

میں نے مذکورہ کشمیری نوجوان سے کہا کہ بنگلور ایک بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں بہت سے لوگ الرسالہ کو برابر پڑھ رہے ہیں۔ مگر کسی شہر میں الرسالہ کے قارئین کا ہونا اور چیز ہے اور شہر کے ہر ہر فرد تک الرسالہ کا پہنچنا دوسری چیز۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے خلاف یا موافق ایک رائے قائم کر لیتا ہے۔ حالاں کہ اس کی رائے اس کے محدود مشاہدہ کی نسبت سے ہوتی ہے نہ کہ وسیع تر معنوں میں پوری صورت واقعہ کی نسبت سے۔ اکثر یقین صرف اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی کو پوری بات کا علم ہی نہیں۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

الرسالہ (انگریزی)

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن فروری ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ اور سالانہ ۳۶ روپیہ ہے ایجنسی وغیرہ کی شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کی ہیں۔

الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن زیادہ تر اردو الرسالہ یا ادارۂ الرسالہ کی اردو مطبوعات کے ترجمے پر مشتمل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو ان اصحاب کے قلمی تعاون کی ضرورت ہے جو انگریزی تحریر پر بخوبی قدرت رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ الرسالہ یا ہماری دوسری اردو مطبوعات سے انگریزی ترجمے کر کے روانہ فرمائیں۔ ہم ایسے لوگوں کے انتہائی مشکور ہوں گے۔ جو اصحاب انگریزی ترجمے کے کام میں معاونت فرمائیں ان سے گزارش ہے کہ ہر ترجمہ، خواہ وہ الرسالہ سے لیا گیا ہو یا کسی کتاب سے، اس کا مکمل حوالہ ضرور درج کریں۔

منیجر الرسالہ: سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳

فارم IV رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۸۴ء

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

MARCH 1984
ISSUE No. 88

AL-RISALA MONTHLY

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول ہدیہ	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہور اسلام	20/-
احیاء اسلام	12/-
پیغمبر انقلاب	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارف اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقت حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ ◻ جمعیۃ بلڈنگ ◻ قاسم جان اسٹریٹ ◻ دہلی ۶